

# فردوس بربیں

از

عبدالحکیم شرود

# فردوس بربیں

از

عبدالحکیم شرود

## پریوں کا غول

اب تو ۱۵۶۷ء ہے، مگر اس سے ڈیڑھ سو سال پیشتر سیاہوں اور خاصیت حا جیوں کے لیے وہ کچی اور اونچی سڑک نہایت ہی اندیشہ تاک اور پُر خطر تھی جو بحر خزر یعنی ملک ماڑندران اور علاقہ شروع ہوتی ہے اور شہر بابل میں ہو کے شاہنامے کے قدیم دیوستان یعنی ملک ماڑندران اور علاقہ رو دبار سے گورتی اور کوہ سار طالقان کو شما آجنو با قطع کرتی ہوتی شہر قزوین کو نکل گئی ہے۔ متوں سے اس سڑک کا یہ حال ہے کہ دن دہاڑے بڑے بڑے قافلے کٹ جاتے ہیں اور بے گناہوں کی لاشوں کو بر ف اور سردی مظلومی قتل و غارت گری کی یا دگار بنائے سا بھا سال تک باقی رکھتی ہے۔

ان دنوں ابتدائی سرماکاز مانہ ہے۔ سال گز شستہ کی بر ف پوری مکھانے نہیں پائی تھی کہ بر ف بر سنا شروع ہو گئی۔ مگر ابھی جاڑا اتنے درجے کو نہیں پہنچا کہ موسم بہار کے نمونے اور فصل کی دلچسپیاں بالکل مت گئی ہوں۔ آخری موسم کے دو چار پچوں باقی ہیں اور کہیں کہیں ان کے عاشق و قد ردان پلبل بد خشائی بھی اپنی ہزار داستانی و نغمہ سنجی کے راگ سناتے نظر آ جاتے ہیں۔ یہ کوہستان عرب کے خشک و بے گیاہ پہاڑوں کی طرح برہنہ اور دھوپ میں جھلسے ہوئے نہیں بلکہ ہر طرف سایہ دار درخت اور گھنی جھاڑیوں نے نیچر پرستوں اور قدرت کے حقیقی قدر انوں کے لیے عَمَدَه عَمَدَه عشرت کدے اور تہائی کی خلوت گاہیں بنارکھی ہیں۔ اور جس جگہ درختوں کے جھنڈتھے، وہاں آسمان کے نیلے شامیانے کے نیچے قدرت نے گھاس کا سبزہ اور محملی فرش بچھادیا ہے جس پر بیٹھ کے کوئی شراب شیراز کے لطف اٹھانا چاہے تو یہاں نہر کے اکے بد لے نہر ویرنجان موجود ہے جو شاید ابھی ڈیڑھ صدی بھی نہیں گزری کہ زوہ سفید سے کاٹ کے پہاڑوں کے اندر مختلف

گھائیوں میں گھمائی اور آخ رشہر خرم آباد کے قریب بحر خزر میں گرانی گئی ہے۔

ان ہی دلچسپیوں اور قدرت کے ان ہی نظر فریب منظروں نے اس کو ہمارے متعلق طرح طرح کے خیالات پیدا کر دیے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ جنت ان ہی گھائیوں میں ہے اور بعض سمجھتے ہیں کہ قدیم دیوالوں کو کیومرث ورستم وزیر بیمان کے زور پر بازو نے فنا کر دیا، مگر ان کی یاد گار میں بہت سی پریاں آن تک ان تہائی کے مقامات میں سکونت پذیر ہیں۔ خوش عقیدہ لوگوں میں سے اکثروں نے ان پریوں کو اڑتے دیکھا ہے اور بعض سیاحوں کو تو پریوں کے بڑے بڑے ہوش ربانیوں گھائیوں سے ناگہاں نکل پڑتے نظر آئے۔ یہ بھی سنا جاتا ہے کہ جو کوئی یکہ و تہا ان پریوں کے غول میں آتا ہے، فوراً مر جاتا ہے۔

مگر پریوں اور قدیم دیوالوں سے زیادہ ظالم ملاحدہ اور باطنیہ لوگ ہیں جو اس علاقے میں آباد اور پھیلے ہوئے ہیں۔ اور جو پرانے اصول و عقائد کا مسلمان ان کے ہاتھ پڑ جاتا ہے، کسی طرح جاں بر نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جمادی الاول، جمادی الآخر اور رجب کے مہینوں میں ان کے مظالم کی دھوم بیج جاتی ہے جس کی وجہیہ ہے کہ علاقہ ہائی تر کستان وغیرہ اور استراخان کے مسلمان جب تھج کو جاتے ہیں تو جہازوں پر بحر خزر سے پار ہو کے اسی علاقے میں اترتے اور اسی کو ہمارا طالقان کو طے کرتے ہوئے ارض عراق کو جاتے اور پھر وہاں سے خاکِ پاکِ حجاز کا ارادہ کرتے ہیں۔ اگرچہ یہاں کے مظالم کی ہر جگہ شہرت ہو گئی ہے اور بہت سے لوگوں نے یہ راستہ چھوڑ دیا ہے مگر پھر بھی بعض بے پروا مسلمان اپنی خوش اعتقادی کے جوش میں آنکھتے ہیں۔ علی الخصوص آمل اور اس کے مضامات کے لیے تو اور کوئی راستہ ہی نہیں۔

یہ سڑک جس کا اُپر ذکر آیا، بہت دور تک پھیلی ہوئی ہے۔ مگر ہمارے پیش نظر صرف وہی

بے جہاں یہ سڑک نہر وینجان کے کنارے کنارے گز ری ہے۔ اس مقام سے علاقیہ روڈ بار کے میدان ختم ہو گئے اور کوہستان سخت اور پیچیدہ نشیب و فراز کی ابتداء ہے۔ یہاں سے کچھ آگے بڑھ کے سڑک اور طرف گئی ہے اور نہر کوہ البرز کے دانتوں میں چکر کھا کے دشوار گزار اور پیچیدہ گھاٹیوں میں غائب ہو گئی ہے۔ شام کو شامد ہی چند گھنٹیاں باقی ہوں گی۔ آفتاب سامنے برف آلو ڈچوٹیوں کے قریب پہنچ گیا ہے۔ اس کی کمزور کرنوں نے جو تھوڑی گرمی پیدا کر دی تھی، مٹ گئی اور ہوا کے سرد جھونکے جو بلند برفتان سے پھسلتے ہوئے آتے ہیں، انسان کے لیے کمپا دینے کو کافی ہیں۔

اس جگہ پر اور ایسی حالت میں شمال کی طرف سے دو مسافر سر سے پاؤں تک کپڑوں میں لپٹے اور دو بڑی گلخانیوں کی صورت بنائے ہوئے آہستہ آہستہ آ رہے ہیں۔ دونوں اپنے چھوٹے چھوٹے اور تھیکے ماندے گدھوں پر سوار ہیں۔ ان کی سوت روئی اور مجموعی حالت سے خیال ہوتا ہے کہ کسی گاؤں کے قریب کے ملا یا فقیر ہیں جو امارت اور سپاہیانہ دونوں وضعوں سے جدا کسی دیشی غرض اور تقدس کی شان سے اس سفر کو نکلے ہیں۔ مگر نہیں۔ وہ قریب آگئے اور معلوم ہوا کہ ملا ہیں نہ مشائخ بلکہ دونوں نو عمر شریف زادے ہیں، اور حیرت کی بات یہ ہے کہ دونوں میں ایک مرد ہے اور ایک عورت۔ ان کے لباس اور وضع سے چاہئے نہ ظاہر ہو مگر بُشرے بتاتے ہیں کہ کسی معزز خاندان کے چشم و چہارٹ ہیں اور ممکن نہیں کہ کسی نامی اور شریف گھرانے سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ اس لیے کہ موئے موئے اور لمبے چوڑے کملوں کے نیچے جنہیں سر سے پاؤں تک پیٹ لیا ہے، دونوں شرفائے آمل کا لباس پہنے ہوئے ہیں۔ مرد جو ایک خوبصورت نوجوان ہے، ایک اونی کفتان پر بڑا پوتین کا لباس پہنے ہوئے ہے۔ سر پر قدیم لمبی تر کی ٹوپی ہے جو بانس کی تیلیوں سے

ایک مختروطی صورت میں بنائے کے بکری کی سیاہ کھال سے مژہ دی گئی ہے۔ ٹوپی پر عمامہ ہے اور اسکے کئی پیچ سر سے نیچے اتر کے کانوں اور گلے میں لپٹنے ہوئے ہیں۔ پاؤں میں موزے اور ایک اونی پاجامہ ہے۔ کمر میں چڑھے کی پینی کسی ہے، جس میں خنجر لگا ہے اور تلوار لٹک رہی ہے۔ اس نوجوان کے پاس کمان اور تیر دن کا ترکش بھی ہے۔ مگر اس عہد قدیم کے یہ ضروری اسلحہ گدھے کی زین میں بند ہے ہیں اور یہی ایک حربہ ہے جس کے ذریعے سے شکار کر کے یہ دلا اور نوجوان اپنے اور اپنی دل رُبَار فیقہ، حیات کے لیے قوتِ ایمُوت حاصل کرتا ہے۔ الغرض ایک گدھے پر تو یہ نوجوان سوار ہے اور دوسرا پر پر ایک انٹھارہ انہیں برس کی پرمی جمال۔ موٹے موٹے کپڑے اور بھڈے پوستین اس کے زاہد فریب حسن کو بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ مگر ایک مہوش کی شوخ ادا یا کہیں چھپائے چھپی ہیں! جس قدر چہرہ کھلا ہے، حسن کی شعائیں دے رہا ہے، اور دیکھنے والے کی نظر کو پہلا ہی جلوہ یقین دلا دیتا ہے کہ ایسی تاز نیں و حسین پھر نظر نہیں آئے گی۔ ہماری آفیٹ روزگار مہ جبیں ایک زرد ریشمی پاجامہ پہنے ہے جو اور پر سے نیچے تک ڈھیلا اور پاؤں کے گھوٹوں پر خوش نہما پکھت کے ساتھ بندھا ہے۔ گلے میں دیباۓ سرخ کا ایک کرتا ہے اور سر پر نیلی پُھولدار طلس کی خمار۔ لیکن یہ سب کپڑے ایک پُھولے پُھولے پوستین کے اندر رُچپے ہوئے ہیں۔ جو چیز کہ اس کے عورت ہونے کو عام طور پر ظاہر کر رہی ہے، وہ چھوٹی چھوٹی سیکڑوں چوٹیاں ہیں جو خمار کے نیچے سے انکل کر ایک شانے سے دوسرے شانے تک ساری پیٹھ پر بکھری چلی گئی ہیں اور راستے کے نشیب و فراز یا گدھے کی تیز روی سے بار بار گھل جاتی ہیں۔

اس دل رُبَار کی کے حسن و جمال کی تصویر دکھانا مشکل ہے۔ مگر غالباً یہ چند باتیں مشتاق دلوں میں اور آرزومند نگاہوں کے سامنے اس کے زاہد فریب چہرے کا ایک معمولی ساخا کہ قائم کر

سکیں۔ گول آفتابی چہرہ جیسا کہ عموماً پہاڑی قوموں میں ہوتا ہے، سُنے اور کھنچے ہوئے، سرخی کی جھلک دینے والے گال، بڑی بڑی شرابی آنکھیں، لمبی نوک دار پیکیں، بلند مگر کسی قدر پچھلی ہوئی ناک اور خمدار ہونٹ، باریک اور ذرا پچھلی ہوئی با چھیں، چھوٹے سے سانچے میں ڈھلی ہوئی نوک دار چھوڑی، شرگیں اور معمولی جھلکی نظروں کے ساتھ شوخ اور بے چین چشم واپر واپر اس تمام سامان حسن کے علاوہ تمام اعضاء جوارح کا غیر معمولی تناسب ہر شخص کو بے تاب و بے قرار کر دینے کے لیے کافی ہے۔

یہ دونوں نو عمر مسافر چاروں طرف کے منظروں کو دیکھتے ہیں اور مقامی دشواریوں کی وجہ سے دل ہی دل میں ڈرتے ہوئے چلے جاتے ہیں۔ دن کے آخر ہو جانے کے خیال سے ان کے نازک چہرے جنہوں نے ابھی تک تجربے کی پختگی نہیں حاصل کی، پریشان ہونے لگے ہیں۔ مگر اس پر بھی خموشی کا قفل نہیں گھلتا۔ ناگہاں کسی فوری جذبے سے مغلوب ہو کے ناز نہیں نے تھنڈی سانس لی اور باریک دفتریب آواز میں پوچھا ”آن کون سادن ہے؟“  
نو جوان: (چکے ہی چکے حساب لگا کر) جعرات۔

لڑکی: (حضرت آمیز لجھے میں) تو ہمیں گھر چھوڑے آن پورے آٹھدن ہوئے۔ (ذرا تامل کر کے) خدا جانے کون لوگ کیا کیا با تینیں کہتے ہوں گے اور کیسی کیسی رانیں قائم کی جاتی ہوں گی۔

نو جوان: یہی کہتے ہوں گے کہ حج کے شوق نے ہم سے وطن چھڑا دیا۔

لڑکی: (پھر ایک آہ سرد بھر کے) مجھے الزام بھی دیتے ہوں گے کہ نامحرم کے ساتھ چل آئی۔

نوجوان: زُمرد (اس لڑکی کا نام ہے) اب میں نامحرم نہیں ہوں۔ دو ہی چار روز میں ہم قزوین پہنچ جائیں گے اور وہاں پہنچتے ہی نکاح ہو جائے گا۔

زُمرد: (پھر لہنڈی سانس لے کر) خدا جانے وہاں تک پہنچنا بھی نصیب ہوتا ہے یا نہیں! راستے کی دشواریاں مشہور ہی ہیں۔ کوئی خوش نصیب مسافر ہو گا جو پریوں کے ہاتھ سے فج کے نکل جاتا ہو گا۔ اور ان سے فج بھی جائے تو ملاحدہ کیوں چھوڑنے لگے۔

زُمرد میں اس وقت ایک غیر معمولی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔ اس مقام نے اسے کوئی خاص بات یاددا دی ہے جس کی وجہ سے وہ چاروں طرف کے منظر کو ہر طرف سے مژمڑ کے دیکھ رہی ہے اور بار بار با رآہ صرد بھرتی ہے۔

نوجوان نے اس بات کا خیال بھی نہیں کیا اور معمولی لمحے میں کہنے لگا ”ملاحدہ کی طرف سے تو مجھے اطمینان ہے۔ اس لیے کہ ان کے نقیب آمل سبحانہ اللہ سے مجھے ایک خط مل گیا ہے۔ وہ ہمیں ایک مجرتب تعویذ کا کام دے گا۔ اور اس کے مذرا کرتے ہی ہم قرمطی کے دستِ ستم سے نجات پائیں گے۔“

یہ باتیں کرتے وقت دونوں نو عمر مسافر اس مقام پر پہنچے جہاں سے سڑک تو کہسار کی بلندی پر چڑھنا شروع ہوتی ہے اور نہر اس سے جدا ہو کے دشوار گز ارگھائیوں اور گھنی خاردار جھاڑیوں میں گھسنے کے لیے دوسری طرف مڑگئی ہے۔ نوجوان نے اپنے گدھے کو سڑک پر آگے بڑھایا ہی تھا کہ زُمرد باغ روک کے لکھری ہو گئی اور کہا ”نہیں حسین،“ (یا اس نوجوان کا نام ہے)۔

حسین: (حیرت سے زُمرد کی طرف دیکھ کر) پھر کہہ؟

زُمرد: جدھر نہ رہ رہی ہے۔

حسین: ادھر تو راستہ نہیں۔

زُمرد: تم چلو تو سہی۔

حسین: آخر تم قزوین چلتی ہو یا کہ کہیں اور؟

زُمرد: نہیں۔ میری منزل مقصود قزوین نہیں۔ مجھے تو دیکھنا ہے کہ نہر کدھر گئی ہے۔

حسین: اس طرف تو پریوں کا نشیمن ہے۔

زُمرد: ہونے دو۔

حسین: سنتا ہوں کوئی ادھر سے زندہ نہیں جاتا۔

زُمرد: یہی میں بھی چاہتی ہوں۔

حسین نے تعجب اور حیرت سے زمرد کی صورت دیکھی اور ایک متاثر کی آواز سے کہا "اور وہ حج کی تیت کیا ہوئی؟"

زُمرد: ہے، مگر اپنے بھائی موسیٰ کی قبر پر جا کے فاتحہ پڑھوں تو مکہ معظمہ کا ارادہ کریں۔

حسین: تمہارے بھائی کی قبر! مگر یہ کیسے خبر کہ کہاں ہے؟

زُمرد: مجھے معلوم ہے۔ راستہ بھی جانتی ہوں اور اس مقام کو بھی۔

حسین: (حیرت سے) تم؟ تم کیا جانو؟

زُمرد: خوب جانتی ہوں۔

حسین: کیا کبھی آئی تھیں؟

زُمرد: نہیں۔ مگر یعقوب جو بھائی موسیٰ کے مرنے کی خبر لایا تھا، اس سے پورا پتا دریافت کر چکی ہوں۔ پہلی نشانی تو یہ ہے کہ جہاں سے نہر سرک سے علیحدہ ہوئی ہے، سرک چھوڑ کے نہر

کے کنارے جانا چاہیے۔ اور بعد کی نشانیاں آگے چل کر بتاؤں گی۔

حسین: یعقوب کو کیا معلوم؟ کون کہہ سکتا ہے کہ ان بلند اور پیچ دریچ پہاڑوں میں کون شخص کہاں اور کیوں کرمارا گیا؟

زمرد: تم نہیں جانتے، بھائی موی اور یعقوب دونوں ساتھ تھے۔ اس مقام پر پہنچ کر نہر کے کنارے کنارے کچھ دور گئے تھے کہ کوہ البرز سے پریوں کا غول اُترا۔ ان کے باٹھے سے بھائی تو مارے گئے اور یعقوب غش کھا کے گر پڑا۔ دوسرے دن جب اُسے ہوش آیا تو بھائی کی اش پڑی پائی۔ نہیں دفن کیا۔ پھر قبر بنائے اور قبر کے پاس ہی ایک چٹان پر ان کا نام کندہ کر کے واپس آیا۔

حسین: مجھے تو غب معلوم ہوتی ہے۔ آخر اس کا سبب کہ پریوں نے یعقوب کو تو زندہ چھوڑ دیا اور تمہارے بھائی مارے گئے؟

زمرد: اس کا یہ سبب ہوا کہ بھائی نے ایک پرمی کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ اور یعقوب بُرول تھا۔ پرمی زادوں کو دیکھتے ہی غش کھا کے گر پڑا۔

حسین: پھر ایسے مقام میں تو ہرگز نہ جانا چاہیے۔

زمرد: نہیں حسین۔ میں ضرور جاؤں گی۔

حسین: فرض کرو کہ ہم وہاں پہنچتے اور ہمارے سامنے پریاں اُتریں تو؟

زمرد: میں تو اس سے نہیں ڈرتی۔ اگر تمہیں خوف ہے تو نہ چلو۔

حسین: تم اکیلی جاؤ اور میں نہ چلوں؟ میں جو تمہاری محبت میں ہر وقت جان دینے کو تیار ہوں۔

زُمرد: حسین، سنو۔ میں تمہارے ساتھ نہ آتی۔ مانگی ہوں کہ تم شریف ہو اور اس زمانے سے جب کہ ہم دونوں مکتب میں ایک ساتھ پڑھتے تھے، مجھے تم سے محبت ہے۔ مگر یہ نہ سمجھو کہ ایک شریف لڑکی کو تم فقرہ دے کے نکال لائے ہو۔ میں خود شوق سے آئی ہوں۔ فقط اتنی امید پر کہ بھائی کی قبر پر کھڑے ہو کے دو آنسو بھاواں گی۔ جب یہ مقصد پورا ہو لے گا تو حج کو چلاونگی۔

حسین: زمرد، اپنی جوانی اور اس کم سنی پر ترس کھاؤ اور اس ارادے سے باز آؤ۔

زُمرد: نہیں، یہ نہیں ہو سکتا۔ اسی آرزو کے لیے بے عزتی گوارا کی ہے۔

حسین: (ما یو تی کی آواز سے) خداوند! اگر جان ہی جانی ہے تو میں مارا جاؤں۔

زُمرد: تیری مصیبت ان آنکھوں سے نہ دیکھی جائے گی (مسکرا کے) گھبراو نہیں۔ ہم دونوں کی کشش ایک دوسرے کو سمجھنے لے گئے۔ مارے گئے تو دونوں مارے جائیں گے۔ یہ کہہ کر زُمرد نے اپنے گدھے کو نہر وینجان کی طرف موڑا۔ دو ہی قدم چلی ہو گی کہ حسین نے روک کر کہا۔ “زُمرد، ذرا صبر کرو۔ چنان ہے تو کل چننا۔ اب شام ہوا چاہتی ہے۔ پہنچتے پہنچتے رات ہو جائے گی۔”

زُمرد: بس اب چلے ہی چلو۔ کہیں آبادی ملنے کی تو امید نہیں اور جب جنگل ہی میں ٹھہرنا ہے تو یہاں وہاں دونوں جگہ برابر ہے۔ حسین سے کسی طرح اذکار کرتے نہ بنی، چل کھڑا ہوا اور دل میں پس و پیش کرتا ہوا زُمرد کے ساتھ کوہ البرز کی تیرہ و تار گھٹائی میں گھسا۔ اب دونوں آہستہ آہستہ چلے جاتے ہیں، اور اس سنسان مقام کا رعب دونوں پر اس قدر بیٹھ گیا ہے کہ بالکل خاموش ہیں۔

جوں جوں آگے بڑھتے ہیں، جنگل گھنا ہوتا جاتا ہے۔ سردی سماں بساعت بڑھ رہی ہے۔

ٹھائے نے نہر کے بہنے کی آواز زیادہ تیز کر دی ہے جس سے اس مقام کے وحشت ناک منظر میں ایک ہیبت پیدا ہو گئی ہے۔ اب راستہ دشوار ہے۔ گدھوں سے اترنا پڑا۔ دونوں آگے چھپے اپنے

گدھے کے دہانے ہاتھ میں پکڑے چٹانوں سے نیچے اور جھاڑیوں میں گھتے چلتے جاتے ہیں۔ آخوندیر کے سکوت کے بعد حسین نے مرعوب ہو کر کہا: ”بے شک پریاں ایسے ہی سنائے کے مقام میں رہتی ہیں۔ انسان کیا معنی، یہاں جانور کا بھی پتا نہیں۔

زمرد: بہاں۔ اور سنتی ہوں کہ اس نہر میں اکثر جگہ پریاں نہباتی ہیں اور بالکوں ہوئے آپس میں کھیاٹ اور چھپنگیمیں اڑاتی بھی نظر آ جایا کرتی ہیں۔

حسین: (چونک کر) یہ سننا تی آواز کیسی تھی؟ جیسے کوئی چیز سن سے کانوں کے پاس سے آگے نکل گئی۔

زمرد: اور یہ مشہور بات ہے کہ پریوں کے تخت چاہے اڑتے نظر نہ آئیں، مگر ان کے نکل جانے کی آواز ضرور سنائی دیتی ہے۔

حسین: یہ بھی ممکن ہے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ کوئی جانور رکھا۔

زمرد: جانور ہوتا تو دکھائی نہ دیتا؟

حسین: اگر چہ ابھی آفتاب غروب نہیں ہوا، مگر یہاں تم دیکھ رہی ہو کہ شام سے بھی زیادہ اندھیرا ہے۔ ایسے دھنڈ لکے میں بعض اوقات اولیا بڑے بڑے چمگاڑ بھی اسی طرح سنائے کی آواز سے اڑتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

زمرد: لیکن اصل میں یہ بھی وہی پری زاد ہیں جو مختلف جانوروں کی صورت میں رات کو نکتے ہیں۔

حسین: ہو گا۔ (اتنا کہہ کے اس نے ارد گرد کے سین کو وحشت اور بزدلی کی نگاہوں سے دیکھا، اور نہایت پریشانی کی آواز میں کہا) شام ہوا چاہتی ہے اور تمہارے بھائی کی قبر کا کہیں پتا

نہیں۔

زُمرد: مگر میں تو بھائی کی قبر تک پہنچے بغیر دم نہ اولے گی۔

یہ کہتے ہی ایک نہایت تاریک گھاٹی نظر آئی جس میں نہر تو گئی ہے مگر دونوں جانب ایسی چکنی اور کثرتی چٹانیں ہیں کہ انسان کا گزرنا بہت دشوار ہے۔ اس گھاٹی کی صورت دیکھتے ہی زُمرد ایک شوق اور بے خودی کی آواز میں چلا اٹھی ”ہاں، دیکھو! یہ دوسری علامت ہے۔ اسی میں سے ہو کے راستہ گیا ہے۔“

حسین: مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ ادھر سے ہم جانیں گے کیونکہ؟

زُمرد: جس طرح بنے، جاؤں گی ضرور۔

حسین: اور یہ گدھے؟

زُمرد: ان کو یہیں چھوڑ دو۔ واپس آ کے لے لیما۔

حسین نے اس مستغل مزاجی پر زُمرد کو تعجب کی نگاہ سے دیکھا۔ پھر گدھے درختوں سے بامدھے اور دونوں چٹانوں سے چھٹتے اور باتھوں سے پتھروں کے سروں کو پکڑتے ہوئے آگے روانہ ہوئے۔ کوئی دوگھری یہ محنت کا سفر کیا ہوگا کہ گھاٹی ختم ہو گئی جس سے نکتے ہی دونوں نے حیرت سے دیکھا کہ نہر ویرنجان اس گھاٹی سے گزر کے یہاں ایک نہایت ہی فرح بخش مرغ زار میں بہنے لگی ہے۔ عجوب لطف کا مقام تھا۔ قدرت نے خود ہی چمن بندی کر دی تھی۔ شگفتہ اور خوش رنگ پھواوں کے تختے دور دور تک پھیلتے چلے گئے تھے۔ نغمہ سخ طیور بھی یہاں کثرت سے نظر آئے، جو ہر طرف شاہدان چمن کے حسن و جمال پر صدقے ہوتے پھرتے تھے۔ شام ہو رہی تھی، اور یہ جوش میں بھرے ہوئے عاشقان شاہد گل اپنے معشوقوں کو آخری الودع کہہ رہے تھے۔ یہ سماں دیکھتے ہی

زمرد نے خوش ہو کے کہا ”اب ہم اپنی منزل مقصود کو پہنچ گئے۔ اس وادی میں بھائی موسیٰ مارے گئے اور یہیں کہیں ان کی قبر بھی ہو گی،“ یہ کہہ کے زمرد ایک نازک بدن اور چست چالاک ہرنی کی طرح چاروں طرف دوڑی اور ایک بڑے پتھر کے پاس پتھر کے چلانی ”آہ! یہی میرے بھائی کی قبر ہے۔“

اس آواز کے سنتے ہی حسین اُدھر دوڑا گیا اور دیکھا کہ ایک چٹان پر موسیٰ نام الحمد اہوا ہے اور اس کے قریب ہی چند پتھروں کو برابر کر کے ایک قبر کی صورت بنادی گئی ہے۔ دونوں نے یہاں لھڑے ہو کر فاتحہ خوانی کی۔ مگر زمرد کے دل پر حسرت و اندوہ کا اس قدر غلبہ ہوا کہ عاشر ہونے سے پہلے ہی وہ گر پڑی اور قبر سے لپٹ کر زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بہت پتھر تسلی دی، نہر سے پانی لا کے منہ ڈھالایا اور رات کے اندھیرے میں اپنی ہو روشن معمتو قہ کو اپنی گود میں لے کے بیٹھا اور سمجھا نے لگا۔

زمرد: (ہچکیاں لے لے کے) حسین مجھے اپنی زندگی کی امید نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہیں مردیں گی۔ ہاتھ پاؤں سُن ہو رہے ہیں۔ کہیجے میں یہاں یہاں درد ہے اور دل بیٹھا جاتا ہے۔ مگر مرنے سے پہلے تم سے ایک وصیت ہے۔ میں مر جاؤں تو میری لاش کو بھی انھی پتھروں کے نیچے جہاں بھائی موسیٰ کی ہڈیاں ہیں، دبا دینا۔

حسین: (نہایت مستغل مزاجی سے، آنکھوں ہی آنکھوں میں آنسو پی کر) یہ وصیت اگر پوری ہونے والی ہو گی تو کسی اور کے ہاتھ پر پوری ہو گی۔ میں تمھارے بعد زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور جس کے ہاتھ سے یہ وصیت پوری ہو گی وہ تمھارے ساتھ میری ہڈیوں کو بھی انھی پتھروں کے نیچے دبائے گا۔

زمرد : (خوشنامہ کے لجھے میں) نہیں حسین۔ ایمانہ کرنا تم کو بھی نہیں معلوم کر مجھے کیا چیز  
یہاں سمجھنے لائی۔ نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ بھائی کی محبت نے اور نہ یہ کہہ سکتی ہوں کہ یعقوب  
کے بیان میں کوئی جادو تھا۔ مگر جس روز اس نے بھائی موی کی حسرت نصیب داستان شائی، اس  
کے دوسرے ہی دن میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے بھائی اس وادی میں کھڑے ہیں۔ خواب  
ہی میں انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف بایا اور تاکید کر کے کہا کہ میری قبر پر آ  
کے فاتح پڑھ۔ مرحوم بھائی نے کچھ ایسی مُوثر وضع سے بایا تھا کہ ان کی اُس وقت کی صورت اس  
وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔ اس سے تم سمجھ سکتے ہو کہ میں یہاں بھائی کی  
بلائی ہوئی آئی ہوں۔

حسین : (وپر گریہ سے بے اختیار ہو کے اور بے انتہا جوش کے ساتھ) خیر۔ تمھیں تو انہوں نے  
خواب میں بایا ہے اور تم مجھے خود اپنے ساتھ لائی ہو۔

زمرد : ہاں۔ ممیں تم کو ساتھ لائی ہوں، اور اسی سبب سے کہ اس دنیا میں مجھے تم سے زیادہ کوئی  
عزیز نہیں۔ اور میری تمنا ہے کہ تمہارے پہلو میں تمہاری آنکھوں کے سامنے جان دوں۔ اس کے  
بعد تم گھر جاؤ اور وہاں عزیزوں اور شہر کے دیگر شہر فاکے نزدیک میری جوبے عزتی  
ہوئی ہے، اُس کو دور کرو، اور میری خبر مرگ کے ساتھ جا کے بتاؤ کہ میں نے کیوں اور کہاں  
جان دی اور مرتے وقت تک ایسی ہی پاک دامن تھی۔ (گلے میں باہیں ڈال کے)  
حسین ! میری آرزو ہے کہ تم زندہ رہو اور میرے دامن سے بدنامی کا دھنباڈھو۔

ناگہاں ایک پہاڑی کی ڈھالو سطح پر کچھ روشنی نظر آئی جس پر پہلے زمرد کی نظر پڑی اور اس نے  
چونک کے کہا ”یہ روشنی کیسی؟“؟ حسین نے بھی اس روشنی کو حیرت سے دیکھا اور کہا۔ ”خداجانے کیا

بات ہے! اور دیکھو، اوہر بڑھتی چلی آتی ہے۔ اس رات کی تاریکی میں یہاں آنے والے کون لوگ ہو سکتے ہیں!

دونوں عاشق و معشوق روشنی کو گھبرا گھبرا کے ساعت بہ ساعت زیادہ متحرک ہوتے دیکھ رہے تھے کہ وہ بالکل قریب آگئی۔ بڑی بڑی پندرہ بیس مشعلیں تھیں اور ان کے نیچے حسین و پری جمال عورتوں کا ایک بڑا غول، جن کی صورت دیکھتے ہی زمرہ اور حسین دونوں نے چیخ ماری۔ دیشت زدگی کی آواز میں دونوں کی زبان سے انکا ”پریاں“!  
اور دونوں غش کھا کر بہ ہوش ہو گئے۔

۱۔ ملکہ کی جمع۔ بے دین لوگ۔ مُراد باطنیہ فرقے کے لوگ۔

۲۔ مسلمانوں کے بعض فرقے جو خلافت عباسیہ کے دور میں شمودار ہوئے۔ ان کی نوعیت سیاسی تھی لیکن انہوں نے مذہب کا لبادہ اور ہر کھا تھا۔ ان میں ایک فرقہ اسماعیلیہ تھا جس کے رہنماء حسن بن صباح نے اسلامی ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے ۱۰۹ء میں ایک دیشت پسند جماعت بنائی اور کوہ البرز (ایران) کے قلعے الحوت کو اپنا گڑھ بنایا کہ اسلامی ملکوں میں اپنے فدائیوں کے ذریعے قتل و غارت گرمی کا بازار گرم کیا۔

پیاری زمرد ۔۔ تو کہاں گئی!

بے مے سُجا وہ رنگیں ، کن گرت پیرِ مُغاں گوید

صحح کا وقت تھا اور نسیم کے جھونکے چل رہے تھے کہ مرغان سحر نے اپنے اپنے شیموں سے نکل نکل کے حسین کو خواب بے ہوشی سے جگایا۔ نہمار کی تی کروٹیں بدل کے آنکھیں ملتا ہوا اٹھا اور چاروں طرف مُڑو کے دیکھا مگر زمرد کا کہیں پتانہ تھا۔ جب معمشوقہ دائر باکی محبت بھری صورت کسی طرف نظر نہ آئی تو لیکا جادھک سے ہو گیا۔ ناتوانی اور سر پھر نے کی وجہ سے کئی دفعہ گر کر اٹھا اور اڑ کھڑا تا ہوا چلا، آس پاس ہر جگہ دیکھا، ہر طرف نظر دوڑا دوڑا کر رہا ہوندا لیکن ناز نیں و ناز آفرین زمرد کا نام دنشان نہیں۔ آخر ہر طرف سے ما یوس ہو کے اور جستجو میں تھک کے موی کی قبر کے پاس آ کے بیٹھ گیا اور نہایت ہی حرست و اندوہ کے عالم میں آنسو بہا بہا کے کہنے لگا:

”پیاری زمرد! تو کہاں گئی؟ آہ! آسمان وزمین کھا گئے یا رات کی پریاں تجھے بھی اپنے ساتھ لے گئیں؟“ اتفاق سے موی کی قبر پر نظر پڑی اور دیکھ کے متوجب ہوا کہ قبر کچھ بدلتی ہوئی تی بے اور دو ایک پتھر زیادہ ہیں جو شام تک نہ تھے۔ حیرت کم نہ ہوئی تھی کہ اس چٹان پر نظر گئی جس پر موی کا نام کھٹا اہوا تھا۔ اور اس کتبے میں بھی کچھ تغیر دیکھ کے غور سے پڑھنے لگا۔ کسی قدر بلند آواز میں اس کی زبان سے انکا ”موی اور زمرد“ اور اس کے ساتھ ہی چیخ مار کر پھر بے ہوش ہو گیا۔ غم و اندوہ کے فوری جھٹکے پر طبیعت پھر غالب آئی، ہوش آیا اور دل میں کہا ”افسوس! وہی ہوا جو زمرد کہتی تھی۔ وہ مر گئی اور میں زندہ ہوں۔ آہ! پریاں شریح المتصیں۔ پھرتی سے اسے مار ڈالا۔ مجھے نیم جان چھوڑ گئیں۔ آہ! وہ میری جان تھی۔ پھر اس کے بغیر کیوں زندہ ہوں؟“۔ یہ کہہ کر اسی چٹان سے سر

ٹکرانے لگا جس پر دونوں بہن بھائی کے نام کندہ تھے۔ دل میں آئی کہ قبر کھول کے اپنے آپ کو بھی اُس میں فہن کر دے، بلکہ اس ارادے سے چاتھا کہ مذہب کے فرشتے نے کان میں کہا ”یہ دین کے خلاف اور مر نے والوں کی تو ہیں ہے۔“ فرشتہ غیب کی آواز سنتے ہی اس نے زور سے چلا کے کہا ”مُو پھر میں کیا کروں؟“ یہ کہہ کر زمین پر گرم پڑا، اور تڑپنے لگا۔ ویر تک تڑپنے اور نالہ وزاری کرنے کے بعد انھا اور دوڑ کر موی کی قبر سے پٹ گیا۔ اب وہا سے زمرد کی قبر سمجھتا تھا اور جس طرح کوئی زندہ شخص کسی طرف متوجہ ہو کے با تیس کرتا ہے، اسی طرح اس قبر کی طرف خطاب کر کے کہنے لگا:

”پیاری زمرد، مرنا اپنے اختیار میں نہیں، خود لشی حرام ہے اور جینا بے سود بے مزہ۔ لیکن کب تک؟ مرنا برحق ہے اور موت ایک دفعہ ضرور آئے گی۔ پھر اس کا انتظار اسی جگہ کیوں نہ کروں۔ زندگی ان باقی دنوں میں تیری قبر میری موسی و جلیس ہو گی اور تیر اخیال میرا باونا معشوق۔ بس اب میں یہیں رہوں گا اور یہیں مروعوں گا۔ ہائے! جس طرح تیرے بھائی نے تجھے اپنے پاس بُلا لیا، اسی طرح ٹوٹ جھے بُلا لے۔ تیری وصیت مجھ سے پوری نہیں ہو سکتی۔ اب میں یہیں کا ہوں۔ کیا عجب کہ پریوں کا پھر کبھی ادھر گزر ہو۔ وہ آسمانی سے مجھے تیرے پاس پہنچا دیں گی۔“

دل میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد حسین کو کسی قدر تسکین سی ہو گئی۔ قبر پر سے اُنھوں کے نہر کے کنارے گیا، پر نعم آنکھوں پر پاک و صاف پانی کے چھینٹے دیے، وضو کیا اور قبر کے برابر کھڑے ہو کر چند انفل رکعتیں ادا کیں۔ پھر بیٹھ کر انہائی خصوصی کے ساتھ زمرد کے لیے دعائے مغفرت کرنے لگا اور ہمیشہ کے لیے یہیں سکونت اختیار کر لی۔

حسین نے کچھ ایسے مضبوط دل سے اپنے لیے یہ زندگی اختیار کی تھی، اور موت کی دعا مانگنے یا جاں

ستاں پر یوں کے انتظار میں اسے کچھ ایسا مزہ ملنے لگا تھا کہ اب اسے نہ وطن یاد رہانے وہ ارادہ نج۔ زمرد کا خیال اس کا قبلہ اور مشترک قبراس کی مسجد۔ گھاس پات اور کبھی کبھی چہ یوں کے شکار پر بسر ہوتی ہے اور پیام مرگ کا ہر گھری انتظار رہتا ہے۔ جب کبھی اندوہ غم کا زیادہ تجویز ہوتا ہے تو اپنی ناز نئیں معشوقہ کی قبر سے لپٹ کے اور رو رو کے دل کی بھڑاس نکال ڈالتا ہے۔

اسی حالت میں رہتے اور موی اور زمرد کی تربت کا مجاور بننے اسے چھ مہینے گزر گئے۔ پہاڑوں کا پورا موسمِ انھی پہاڑوں پر بسر ہوا، جہاں ایک عرصے تک ان مظلوم شہید ان حسرت کی قبر پر برف کی چادر چھپ رہی۔ موسم کی سخت سردی اور برف باری اس نے صبر و شکر کے ساتھ جھیل لی۔ اب بہار کا زمانہ ہے اور ہر طرف پہاڑوں کی پہلو نشیں وادیاں، اور یہ سارا مرغزا رپھلوں سے بھرا ہوا ہے۔ ہوا کے جھونکے ہمیشہ معطر و مشکبار رہتے ہیں اور دل کا اولہہ ساعت بساعت زیادہ بڑھتا جاتا ہے۔ حسین کا غم اب پہلے سے زیادہ جوش و خروش پر ہے اور ان ظالم پرمی وشوں کے انتظار میں بے صبری اور بے چینی پیدا ہو چکی ہے۔ روز رو رو کے کہتا ہے ”فسوس! موی اور زمرد کا کام تو پر یوں نے ایک ہی دن میں تمام کر دیا اور میں ایسا بد نصیب ہوں کہ انتظار ہی انتظار میں چھ مہینے گز رکھنے اور وہ گویا ادھر کا راستہ ہی بخول گئیں۔“

ایک دن وہ صحیح کسو کے انہا تو خلافِ معمول زمرد کی قبر پر ایک گاندھ پڑا ملا۔ حیرت و شوق سے دوڑ کے اسے انھالیا اور پڑھا تو چند لمحے تک تفہیم حیرت بنا کھڑا رہا۔ بار بار تحریر کو غور کر کے دیکھتا اور کہتا، ”کہیں نگاہ غلطی تو نہیں کر رہی ہے؟“ مگر ساعت بساعت یقین ہوتا جاتا کہ خاص زمرد کے ہاتھ کی تحریر ہے۔ اس خط کی عبارت یہ تھی:

”حسین! میں اس عالم میں نہایت ہی خوش ہوں۔ یہاں کی مسافت تیرے وہم و قیاس سے باہر ہے۔“

میں اسی باغ میں ہوں جس کا قرآن اور تمام کتب سماوئیں ہر مسلمان اور خدا شناس سے وعدہ کیا گیا  
ہے۔ یہ سب لذتیں مجھے خدا کی مہربانی سے حاصل ہیں۔ زہرہ و مشتری جن کی شعاعیں تجھے دور  
سے نظر آتی ہیں، میری انیس و جلیس ہیں۔ ان کا قصہ تو نے سنابے مگر یہ نہیں جانتا کہ اس عالم نور  
اور اس مرکزِ الہوت کی مسٹریں کتنی لفڑیب ہیں کہ انھیں ہاروٹ و ماڑوٹ کی جانبازی کا خیال بھی  
نہیں آتا۔ مگر میں یہاں بھی تیرے لیے حیران اور تجھے سے ملنے کی مشتاق ہوں۔ فرشتوں اور دیگر  
روحوں کے ذریعے سے مجھے برادر معلوم ہوتا رہا کہ تو میری قبر کا مجاور بنا بیٹھا ہے۔ وہ ماڈی کشش جو  
ایک عرصے تک روح کو عالم عناصر کی طرف متوجہ رکھتی ہے، مجھے بارہا میری قبر پر لگئی۔ میں نے  
تجھے اپنی قبر سے پٹ کے روٹے دیکھا اور خود بھی تیرے ساتھ گھنٹوں لھڑی رویا کی۔ مگر افسوس! نہ  
تیری دنیاوی آنکھیں میری صورت دیکھ سکتی تھیں اور نہ تیرے مادی کا نام میرے روئے کی آواز سن  
سکتے تھے۔ تو نا حق موت کا منتظر ہے۔ ابھی تجھے بہت دنوں دنیا میں رہنا ہے۔ وہ وقت دور ہے  
جب کہ مجھے تیرے وصال کی خوشی حاصل ہوگی۔ وہ باغ جہاں ٹو ہے، پر یوں کا نیشن ہے، مگر  
تیرے سبب سے وہ وہاں نہیں آ سکتیں۔ اور چونکہ ابھی تیرے مرنے کا وقت نہیں آیا، لہذا تجھے قتل  
بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ اسہاب ہیں جن کی وجہ سے وہ کسی طرح اپنی تفریح گاہ کو تجھے سے خالی نہیں کر  
سکتیں۔ مجبوراً خود انھی کو اپنا نیشن چھوڑ دینا پڑا۔ افسوس! تو نے میری وصیت پر عمل نہ کیا۔ بد نام  
کرنے والے اور میرے نام پر تہمت لگانے والے اسی طرح ذلیل کر رہے ہیں۔ ان کے افتر اور  
طور مار مجھے بہت ستاتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں تجھے پھر اپنی وصیت یا دلالاتی ہوں اور نہایت ہی  
آرزو کے ساتھ رکھتی ہوں کہ جا اور میری وصیت پوری کر۔ تجھے سے دور اور تیری دلدادہ زمرہ  
حسین نے ہزار بادفعہ اس خط کو پڑھا۔ اس کی طرز تحریر، خط اور الفاظ کو غور سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ

کے دیکھا۔ کسی طرح سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا مضمون ہے۔ ایک دفعہ گھبرا کے بولا ”کیا زمرِ دزندہ ہے؟“ پھر آپ ہی کہنے لگا ”نہیں، ممکن نہیں۔ وہ خود ہی لکھ رہی ہے کہ دوسرے عالم میں ہے اور فردوس بریں کی سیر کر رہی ہے۔ پھر یہ خط کیوں کر آیا اور کون لایا؟“؟ دیر تک غور کرتا رہا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے۔ پہلے دل میں آئی کہ زمر دکی ہدایت کے موجب گھروالا پس چاہائے مگر پھر آپ ہی بولا ”نہیں، بالکل ہے حاصل ہو گا۔ اول تو وہاں تک جایا کس سے جائے گا اور بالفرض جاؤں بھی تو اس قصے پر یقین کے آئے گا۔ سب مجھے چھڈا کر بے وقوف بنائیں گے۔ میں نہیں جا سکتا۔“ اب تو عہد کر چکا ہوں کہ زندگی کی سب باقی ماندہ دن اسی قبر اور زمر دکی یادگار کے پاس بس رکروں گا۔ زمر دکھتی ہے کہ مجھے ابھی بہت دنوں ایڑیاں رکھ رہا ہے۔ بہتر ہے۔ رکھوں گا اور جہاں تک جھیا جائے گا جھیلوں گا۔ اس جگہ ایڑیاں رکھنا بھی زمانے کی خاک چھانٹنے سے اچھا ہے۔ افسوس! زمر دل میں خفا ہو گئی کہ اب بھی میری وصیت پوری نہ کی۔ لیکن میں غدرات پیش کیے دیتا ہوں۔ جو فرشتے میری روز روز کی خبر اس تک پہنچاتے ہیں، میرا غدر رجھی گوش گز ارکر دیں گے۔ یہ ممکن ہے کہ اس وقت وہ کھڑی مجھے دیکھ رہی ہو۔ میری باقی اپنی کانوں سے سن رہی ہو۔ ممکن ہے کیا معنی، بالکل قرین قیاس ہے۔ اب اپنے خط کا جواب سننے کے لیے اس کی روح اس وقت یہاں ضرور آئی ہو گی۔ ہاں، تو جو کچھ کہنا ہے، اسی سے کہوں۔“

یہ خیال اس کے دل پر جنم گیا اور زمر دکی قبر کی طرف دیکھ دیکھ کے یوں کہنا شروع کیا ”پیاری زمر دا نہ میں اس قبر پر نور میں ہوں جہاں ثوہے اور نہ میرے پاس وہ نورانی نامہ بڑی ہیں جو مجھے خاکی پیکر کا خط تیرے پاس پہنچا دیں۔ اپنی نورانی اور نوری تو جسے کام لے اور خود میری زبان سے غدر سُن۔ حور و ش اور مقبول الہی ناز نہیں! اور غواصِ دریائے رموزِ وحدت اور کثرت! کیا عجب کہ اپنے

نور اور تحریر کی آنکھوں سے تو میری اس وقت ستم زدگی کا تمثاشاد بیکھر رہی ہو یا یہ میری آہ وزاری کی جگہ دوز آواز تیرے روحانی کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ زمردا مجھے ان لوگوں کے پاس نبھیج جن کے فہم وادرائے سے تیری روحانیت اور تیری مقبولیت و معصومیت کا قصہ بالاتر ہے۔ وہ میرے کہنے کا یقین نہ مانیں گے۔ لہذا اپنے عشق میں مجھے اس ذلت و رسوانی سے بچا اور اگر بارگاہِ لمبیل میں تیری آواز کچھ بھی اثر رکھتی ہو تو مجھے کوشش کر کے اپنے پاس بُلا لے اور ان پر یوں کو جلدی بھیج کر وہ اپنی تفریح گاہ کو مجھ سے خالی کرالیں میری روح تیرے شوق میں ذبح کیے ہوئے ایک طائر کی طرح تڑپ رہی ہے اور اس ناری پنجھرے سے نکلنے کے لیے پھرستی ہے۔ محبت والی ناز نہیں امجھے اور کہیں نہ بھیج بلکہ اپنے پاس بُلا۔

اس قسم کے خیالات ظاہر کرتے کرتے حسین کا جوش اس قدر بڑھ گیا کہ بے تاب ہو کے زمین پر گرا اور لوٹنے اور تڑپنے لگا۔ اور جب جب ناتوانی زیادہ ہوئی تو قبر سے لپٹ کے بے ہوش ہو گیا۔ اب اس خط نے اس کا جوش بڑھا دیا تھا اور اس کے دن پہلے سے زیادہ غم و اندوہ میں گزر رہے تھے۔ زمرد نے عالم پرستان سے جو مُراسلت کی تھی، اُس نے دل کے جذبات کو یہاں کیک ابھار دیا۔ روز جنت نشین معمشوق کو خواب میں دیکھتا اور روز ایک نیا خیال پیدا ہوتا۔ شاید عالم آخرت کا اتنا علم و یقین کسی مسلمان کو کم ہو گا جتنا کہ فی الحال حسین کو تھا۔ دنیا اس کی نظر میں ہیچ تھی۔ وہ اپنے آپ کو عالم نور و ظلمت کے مابین ایک برزخ میں پاتا اور بے خبری اور خود فراموشی کے ساتھ چاہتا تھا کہ کسی طرح اس مادی اور جسمانی جامے کو چاک کر کے عالم نور میں جا پہنچے۔ اس حالت کو بھی ایک مہینہ ہو گیا، جس کی ہر گھری زمرد کے کسی نئے خط کے انتظار میں گزر رہی تھی۔ آخر انتظار کا زمانہ ختم ہو گیا اور ایک خط ملا جس کا مضمون یہ تھا: "اے محبوبِ ظلمت کدہ ارضِ میری جستجو میں تو حد سے گزر راجا تا

بے اور یہ نہ سمجھ کے مجھ پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ میرے تعلقات تیرے ساتھ وابستہ ہیں اور یہی سبب ہے کہ اس عالم میں بھی جہاں ہر طرف سے مسٹر تیں ہجوم کیے ہوئے ہیں اور خداوند جل و علا نے ایک خاص بعید از فہم و ادراک لذت میرے دل میں پیدا کر دی ہے، میں تیری طرف سے اپنا خیال نہیں ہٹا سکتی۔ تیری یاد میں یہ روحانی لذتیں بھی میرے دل سے کاٹنے نکال سکتیں۔

”خیرا بُثونے پورا امتحان دیا ہے اور کوئی چیز تیرے دل سے میرا خیال نہیں نکال سکتی، تو ما یوس نہ ہو اور مجھ سے ملنے کا سامان کر۔ یاد رکھ! یہ وہ جگہ نہیں ہے جہاں تو مجھے پا سکے گا۔ میں تجھ سے قریب بھی ہوں اور دُور بھی ہوں۔ لیکن جس دروازے سے ٹو میرے پاس آ سکے گا وہ بہت فاصلے پر ہے اور وہاں تک تو بڑی محنت و ریاضت سے پہنچ سکے گا۔ اس کام کے لیے تجھے نفس گشی اور ریاضت بھی کرنا ہوگی اور بڑے بڑے سفر بھی کرنا پڑیں گے۔ اس طرح بے مرشد و رہبر پہاڑوں سے ٹکرانا بے شود ہے اور نہ اس رونے دھونے سے کچھ اثر ہو گا۔ اگر مجھ سے ملنے کا شوق رکھتا ہے تو اس وادی سے نکل اور کوہِ جودی کی مغربی پہاڑیوں میں جا۔ وہاں ایک بڑا غار ہے جس میں بڑے بڑے خدا شناس اور چلہ کشی کر چکے ہیں۔ لوگ نہیں جانتے مگر مجھے یہاں آ کے معلوم ہوا کہ جس غار میں جناب ابراہیم علیہ السلام نے کواکب کے طاوع و غزوہ سے فتنہ عزائم کر کے خدا کو پہچانا تھا، وہ یہی غار ہے۔ اب لوگ اس غار کو ارضِ شام میں بتاتے ہیں۔ لیکن یہ صریح جھوٹ ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچپن شام میں نہیں گزر را بلکہ اس سرز میں میں جہاں ان کا وطن تھا اور جہاں نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہر نے کے بعد ان کی نسلِ سکونت پذیر ہو گئی تھی۔ اس غار میں ٹو چا لیس دن تک بیٹھ کے چلہ کھینچ اور کوشش کر کے اس مدت میں ہر چوتھے دن صرف تھوڑی سی بناتی قوتِ الایمoot پر زندگی بسر کر۔ یہ بھی ضروری ہے کہ پورے چلے بھر صرف ایک صورت تیری نظر کے

سامنے ہو اور صرف ایک خیال تیرے دل میں ہو۔ وہ صورت تو میری ہے اور خیال ان مرشد کے ملنے کا جن کے مریدوں میں شامل ہونے کوٹو غار سے نکل کے روانہ ہوگا۔ اس چلے کی تہائی میں تو اکثر دیکھے گا کہ میں تجھے اپنی طرف بُلا رہی ہوں۔ مگر خبردار! اس خیالی پنکر کے دھوکے میں نہ آنا۔ کہیں ذرا بھی تیرے قدم کو اغزش ہوئی تو سمجھ لے مجھ سے ملنے کی کوئی امید نہیں۔

چالیس دن کے بعد پچھلی رات کو اس غار اور کوہ وجودی کی گھاٹیوں سے سر زمین شام کو روانہ ہوا اور بغیر اس کے کسی اور جگہ مقام نہ کرے۔ بخط مستقیم شہر خلیل میں جائے۔ وہاں کے مشہور تھے خانے میں حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے جنازے رکھے ہوئے ہیں۔ لوگوں سے آنکھو بچا کر اتر۔ لوگ تجھے روکیں گے۔ مگر ایسی کوشش کر کے نگہبان اور مجاہروں کو خبر نہ ہو اور تو اندر پہنچ جائے۔ چالیس دن تک ان دونوں جنازوں کے درمیان بیٹھ کر چلے کھیجیں۔ پھر وہاں سے نکل کر شہر حاب کو جا۔ وہاں محلہ رامنہ کے عقب میں تجھے ایک چھوٹی سی مسجد ملے گی جو مسجد اشمانیں کہلاتی ہے۔ اس مسجد میں جا کے ٹھہر۔ دوسرے ہی دن نماز فجر کی جماعت میں ایک شخص آئے گا جو صوف کے پیڑے پہنے ہوگا۔ اس کے بال لمبے ہوں گے اور ایک سیاہ کملی میں اپنا سارا جسم چھپائے ہوگا۔ اس شخص کی چھوٹی سی ڈاڑھی میں نصف سے زیادہ بال سفید نظر آئیں گے اور اس کا عمameہ سبز ہوگا۔ اس لیے کہ سادات بنی فاطمہ سے ہے۔ اس نورستان میں اگرچہ وہ اور کسی خطاب سے یاد کیا جاتا ہے مگر اس عالم عناصر میں اس کا نام شریف علی وجودی ہے۔ یہ شخص اگرچہ بالکل منکرانہ مزان وضع کی نظر آئے گا مگر اس کی آنکھوں سے ریاضت و نفس کشی اور جذبات روحانی زیادہ ہونے کی وجہ سے شعلے نکتے ہوں گے۔ خوب یاد رکھ کہ جب تک ٹو شریف علی وجودی کے سامنے نہ جا پہنچے گا، وہ تیری طرف توجہ نہ کریں گے۔ ان بتائی ہوئی نشانیوں سے تو انھیں پہچان

سکے گا۔ اُن سے میرا خواست گارہونا۔ وہی شخص تجھ کو مجھ سے ملا سکتا ہے اور اُسی کے ہاتھ میں ہماری کامیابی ہے۔ اگر تو میرا شیدا اور آرزومند ہے تو جب تک مقصد برآ ری نہ ہوشیخ کی خدمت اور غلامی کرنا۔ اگر تو پورے ایک سال تک شریف علی وجودی میں رہے گا تو کوئی ایسا موقع ضرور پائے گا جب کہ وہ ایک جوش اور ولولے میں آ کے انسان کو ملا عالیٰ کی سیر کرادینے کا دعویٰ کریں گے۔ دعویٰ سنتے ہی ان کے قدموں میں گر کر اپنی دلی آرزو ظاہر کرنا۔ وہ بے شک منظور کریں گے۔ مگر اس کا خیال رہے کہ شیخ کے ہر حکم کی تعمیل، خواہ تیری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، بے خذرا اور بالا تجھت کرتا:

## بے م سجادہ رنگیں گن گرت پیر مغاں گوید

اگر یہ سب مراحل ٹو نے طے کر لیے اور شیخ کی اطاعت میں پوری سرگرمی اور گرم جوشی دکھادی تو جان لے کہ میرا آنکھ تیرے لیے کھلا ہوا ہے۔ تجھ سے زیادہ میں تیرے لیے حیران ہوں، بس اب جلدی اُس وادی میں پہنچ اور میری قبر کو چھوڑ اور مجھ سے ملنے کی کوشش میں استقلال و مستعدی دکھا۔

### تیری مشتاق شیدا زمرہ

حسین اپنے جوش محبت میں احباب سے متفہر ہو جانے کی وجہ سے زمرد کی پہلی وصیت اور اُس کے بعد گزشتہ خط پر عمل نہیں کر سکتا تھا۔ مگر اس خط کے بعد ممکن نہ تھا کہ گھڑی بھر کے لیے بھی اس وادی میں بھر سکے۔ زمرد کی محبت و وفا شعاری یاد آئی اور نہایت ہی جوش و خروش کے ساتھ زمرد کی قبر سے رخصت ہوا۔

تنگ و تاریک گھائی سے بیزار دشواری سے منجل منجل کے انکا اور اُسی مقام پر پہنچا جہاں اپنے اور

زمرد کے گدھوں کو درختوں سے باندھنے کے چھوڑ گیا تھا۔ دونوں گدھے بند ہے ہے سوکھنے کے، سردی و برف باری کے صدمے اٹھا کے مر گئے تھے۔ ان کی ہڈیاں درخت کے نیچے پڑی ہوئی تھیں۔ مگر یہ دیکھ کے نہایت ہی متاخر ہوا کہ قدیم گدھے کے بد لے اب ایک اور تازہ دم گدھا اس درخت میں بندھا اور کسا کھڑا ہے۔ خلافِ امید اس سواری کو پا کے اُس نے خداوندِ کریم کا شکر ادا کیا جس نے عالمِ نور کے بہت سے رُموز اس دنیا ہی میں اس پر ظاہر کر دیے، اور آگے کی راہ لی۔ جہاں تک راستہ خراب اور پیچیدہ تھا، وہاں تک تو وہ گدھے کا دہانہ پکڑے ہوئے پا پیا دھیا۔ جب صاف اور کشاور زمین آگئی تو اس خدا کی دی ہوئی سواری پر سوار ہو کے سیدھا مغرب کی طرف چل کھڑا ہوا۔ چونکہ اس کو ہستان کا سلسلہ بھی مشرق سے مغرب کو گیا ہے، لہذا اس کے دامن میں باد یہ پیاسی شروع کی اور دو مہینے کی دشت نور دی کے بعد علاقہ آذربائیجان کے شہر تبریز میں جا پہنچا، جہاں سے کوہ جودی دس بارہ دن کی مسافت پر ہے۔ تبریز ایسا بارونق شہر تھا کہ حسین کے دل میں آئی کہ دو دن تھہر کے سیر کرے۔ مگر زمرد کی تاکیدیا داد آئی اور بغیر اس کے کہ کارواں سرانے میں کمر بھی کھولی ہو، آگے کی راہ میں اور دس روز دشت نور دی کے بعد کوہ جودی کی سرفراز چوٹی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

کوہ جودی بہت بلند پہاڑ ہے، اور ایران اور ایشیائے کوچک بلکہ سلسلہ کوہ قاف کی اکثر چوٹیوں سے زیادہ بلند ہے۔ حسین پہلے ایک بڑا چکر کھا کے اس زبردست اور برف سے ڈھکے ہوئے قلعے کے مشرقی پہلو پر نکل گیا اور اس غار کو ڈھونڈنے لگا جس میں اُسے چلنا کشی کرنا تھی۔ کئی روز تک چٹانوں اور گھاٹیوں میں نکراتے رہنے کے بعد وہ غار ملا۔ دور دور کے گاؤں والے اکثر اس غار کی زیارت اور اس کے تاریک دہانے پر کچھ نہ کچھ چڑھانے کو آتے رہتے تھے۔ لوگوں میں اس کی

قدیم برکتوں کے بہت سے قصے مشہور تھے اور یہود و نصاریٰ و مسلمان سب اُس کی حرمت اور ادب کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ انھی گاؤں میں ایک زائر کی زبانی حسین کو غار کے حالات معلوم ہوئے اور سمجھ گیا کہ یہی وہ مقام ہے جہاں اسے اپنی ریاضت اور نفسِ اشی کا پہلا امتحان دینا ہے اور جہاں جناب ابراہیم علیہ السلام نے خدا کو پہچانا تھا۔

دن کو جب حسین اس غار کے دہانے پر پہنچا، وہاں اضافی جودی و لہنان کے چند خوش عقیدہ زائروں کا مجتمع تھا۔ شام کو ان کے واپس جانے کے بعد جیسے ہی آفتاب غروب ہوا، وہ خدا کا نام لے کر اندر گھسا۔ غار میں جاتے ہی ریاضت میں مشغول ہو گیا اور کوشش کرنے لگا کہ وہاں کی بھیانک تاریکی میں زمرہ دکی خیالی تصویر کا چرائی بنانا کے ہر وقت نظر کے سامنے رکھے، چوتھے دن پچھلی رات کو نکل کے گھاس اور پتوں سے بھوک کی خدمت کم کر لیتا اور پھر اسی خلوت کر دے میں جا بیٹھتا۔

آخر چالہ پورا کر کے پرمیوش نوجوان نے شام کی راہی۔ تین مہینے کے سفر کے بعد مقدس شہر خلیل کی عمارتیں ناظروں کے سامنے تھیں۔ آبادی میں داخل ہو کے سیدھا اس تھا نے پر پہنچا، مگر یہاں یہ پہنچنے اترنا بہت دشوار تھا۔ اس لیے کہ ہر وقت لوگوں کا مجتمع رہتا اور خرابی یہ تھی کہ جو کوئی اس مقدس غار میں اترنے کا ارادہ کرے، پہلے اجازت لے۔ لہذا عام مجاورین کو دوست بنا کر اجازت حاصل کرنے کے لیے راستے کے قریب ہی شب باش ہوا۔ کئی رات میں جاگ کر کاٹیں مگر موقع نہ ملا۔ اس لیے کہ اکثر لوگ یہاں پاس ہی شب بیداری کرتے تھے، اور ایسا کوئی وقت نہ ملتا جب کہ لوگ مصروف دعا و عبادت نہ ہوں۔ دو تین ہفتے کے بعد ایک مرتبہ پچھلی رات کو اٹھ کے دیکھا تو میدان صاف تھا اور جو لوگ تھے، وہ سوربے تھے۔ چکپے چکپے دبے پاؤں تھے خانے کے دروازے پر گیا

اور چاروں طرف دیکھ کے اطمینان کر لیا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا تو بے تکلف نیچے اتر گیا۔

اس مقام پر جانا بڑی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔ ان انبیاء نے عظام کا رُعب ساعت بساعت دل پر غالب آتا جاتا تھا۔ پاؤں کا نپ رہے تھے اور دل دھڑک رہا تھا۔ تا ہم زمر دکا شوق ان تمام دلی کمزوریوں پر غالب آیا۔ وہ برابر بڑھتا چاگیا۔ بار بار اسے معلوم ہوتا جیسے فرشتے روک رہے ہیں کہ اس مقدس جگہ کو اپنے قدموں سے ناپاک نہ کر۔ مگر ان سب خیالات کو مٹا مٹا کے وہ گھٹائوپ اندھیرے میں ہاتھوں اور پاؤں سے ٹوٹا ہوا تھا تک پہنچ گیا۔ رات کا وقت اور پھر وہ تاریک مقام، حسین پہنچ کر پریشان ہوا کہ ہاتھ کو ہاتھ سمجھائی نہیں دیتا، بزرگ پیغمبروں کے جنازے کیونکر نظر آئیں گے۔ عرصے تک ایک ہی جگہ کھڑا سوچتا رہا۔ اب دل کو مضبوطکر کے آمادہ ہوا کہ ٹول کے آگے بڑھے کہ ناگہاں صحیح کی شعاعیں اور پرستے پہنچیں اور وہ ٹھہر گیا کہ روزِ روشن ہو لے تو زیادہ آسمانی سے اپنے مقصودہ مقام پر پہنچ سکوں گا۔ اور یہی ہوا۔ دن کی روشنی نے اندھیرا کم کر دیا اور اسے کئی لاشیں چھوڑتے پر کھیں نظر آئیں جن میں سب کے درمیان حضرت یعقوب و یوسف کے جسم تھے۔ ان کا انتقال چونکہ مصر میں ہوا تھا، لہذا قدیم مصریوں کے مذاق پر ان کی ممیاں بنائی گئی تھیں۔ ان کے جسم آئینے کے تابلوں میں تھے، جن سے اس تاریکی میں ایک عجیب رُعب و جمال برستان نظر آتا تھا۔

حسین یہ مقدس چہرے دیکھ کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ کسی طرح قدم آگے بڑھانے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ چند لمحے تک مرعوب اور سہا کھڑا رہا اور پھر جی کڑا کر کے قدم آگے بڑھایا اور دونوں کے درمیان میں جا کے چپکے سے بیٹھ گیا، جہاں دونوں کے باہیت چہرے ہر وقت اس کے پیش نظر رہتے اور ان کا رُعب اس قدر غالب تھا کہ زمر د کے خیال کو وہ مشکل سے آنکھوں کے

سامنے متشکل کر سکتا تھا۔ مگر کوہ جودی کے چلے کی کوشش نے وہ پیاری صورت زیادہ استقال کے ساتھ نظر کے سامنے قائم کر دی اور تھوڑی ہی کوشش سے ان دونوں متبرک چہروں کے درمیان میں وہ اپنی معشوقہ کا جلوہ دیکھ لیا کرتا تھا۔

الغرض یہاں بھی وہ چلہ کشی میں مشغول ہو گیا۔ یہاں کوہ جودی کے غار کی طرح یہ ممکن نہ تھا کہ کسی وقت نکل کے ثوٹ لا یہوت حاصل کرے۔ اس کا خیال اُسے پہلے سے تھا اور اس ضرورت سے تھوڑا سا پیش اپنی چادر میں بامدھ کر لیتا آیا تھا۔ دو تین نکلے چوتھے دن لکھا کے شکر گزار ہوتا۔ خدا کر کے یہ چلہ بھی پورا ہوا۔ اکتالیسویں رات کو وہ چپکے چپکے اور دبے پاؤں باہر لکا کہ کسی کوخبر نہ ہو، اور وہ حلب کی راہ لے۔ مگر لوگ جاگ رہے تھے جن میں سے بعض اُسے پہلے ہی دیکھے چکے تھے۔ انہوں نے دیکھتے ہی ٹلیں مچا کے حملہ کیا اور وہ غار سے نکتے ہی مجاہروں کے ہاتھ میں گرفتار ہو گیا۔ قریب تھا کہ قتل کر دیا جاتا، مگر اتفاق یا اس کی خوش قسمتی سے ایک روز ایک باطنی فدائی کے ہاتھ سے شہر خلیل کا حمران مار دیا گیا تھا۔ لوگ اگرچہ باطنیہ لوگوں سے ڈرتے تھے مگر آخر بڑا اہم معاملہ تھا۔ وہ انتقام کے درپے تھے اور باطنیوں کے ایک گاؤں پر تاخت کرنے کا سامان کر رہے تھے کہ باطنیوں کا ایک بڑا بھاری گروہ خود ان پر آپڑا۔ سخت خون و قتل ہوا۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور اسی بے امنی کی حالت میں حسین مجاہروں کی قید سے چھوٹ کر حلب روانہ ہوا۔

آن ٹھویں دن شام کے وقت حلب میں داخل ہوا۔ راہ گیروں سے پوچھتا ہوا محلہ رامنہ اور پھر مسجد الشمانیں میں پہنچا۔ یہاں آتے ہی کمر کھول دی اور سر شام ہی کچھ کھاپی کے عشتاء کی نماز پڑھی اور سو گیا۔ اگرچہ تھا کہ ماندہ تھا مگر زمرد کے وصال کا شوق سر پر غالب تھا۔ آدمی رات سے زیادہ نہ گزری ہو گی کہ آنکھ کھل گئی اور صبح تک نمازِ فجر کے انتظار میں کروٹیں بدلتا رہا۔ صبح کی اذان سے

پہلے ہی وضو کر کے تیار ہو گیا اور دروازے پر بیٹھ کے ہر آنے والے کی صورت کامٹا لعہ کرنے لگا۔ آس پاس کے مکان والے غیند کے خمار میں لڑکھراتے اور انہوں کی صورت کا دھوکا ہوا۔ مگر کسی طرح مشغول ہو جاتے۔ حسین کو اکثر لوگوں پر شیخ شریف علی وجودی کی صورت کا دھوکا ہوا۔ مگر کسی طرح اطمینان نہ ہوتا تھا۔ آخر دل ہی دل میں پر بیشان ہونے لگا اور اپنی طرف خطاب کر کے چپکے سے کہا:

”مجھے یقین نہیں کہ شیخ سے مل سکوں۔“ یہ جملہ اس کی زبان سے اکلا ہی تھا کہ اُسی حالیہ وضع کا ایک شخص آیا، اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر لکھرا ہو گیا اور نہایت تسلی و تشفی کے لمحے میں بولا حسین، میں جانتا ہوں کہ تو میری تماش میں آیا ہے۔“ اتنا سمعنا تھا کہ حسین ان کے قدموں میں گرد پڑا، اور ان کے پاؤں کو اپنے آنسوؤں سے دھوکے کہنے لگا۔

”یا حضرت امیری مدد کیجئے! صرف آپ ہی کی راہبری سے مجھے حق کا راستہ مل سکتا ہے۔ جس صراطِ مستقیم پر چل کے انسان خدا اور عالم ارواح کو پہچان سکے، وہ صرف آپ ہی جانتے ہیں۔“  
شیخ: (جال میں آ کے) اسے بھر و جود اور دریائے وحدت کے ذیل و ناپاک قطرے اتیرا کیا  
حوالہ ہے کہ اس غیر موجود اہوت غیر منون کے رموز کو سمجھ سکے۔

حسین: بے شک امیری کوئی ہستی نہیں۔ مگر جب آپ سے شناور بھر وحدت کا ہاتھ پکڑاں گا تو کیا عجب کہ اس طوفان خیز دریا سے پار ہو جاؤں۔“ اور یہ کہہ کہ رو رو کے پھر شیخ کے قدم پہومنے لگا۔  
شیخ کا جال کسی قدر کم ہوا۔ انہوں نے حسین کو پکڑ کے اٹھایا اور سینے سے لگایا اور اپنا سینہ کی دفعہ زور سے اس کے سینے سے رکڑا اور کہا ”اچھا میرے ساتھ چل۔“ میں تیرے ضبط و ظرف کا اندازہ کروں گا۔ اور جب معلوم ہو جائے گا کہ تیری طلب کہاں تک صادق ہے، اُس وقت تجھے اپنے حلقہ

ذوق میں شریک کروں گا۔“

حسین نے یہ سن کے شکرگزاری کے طریقے سے سر اٹھایا، شیخ کے ہاتھ کو بوس دیا اور ان کے ساتھ جا کے نماز میں شریک ہوا۔ نماز کے بعد شیخ شریف علی وجودی اپنی خانقاہ میں لے گئے جو شہر سے کچھ فاصلے پر ایک غیر آباد مقام میں تھی۔ حسین کو یہ خیال کر کے تعجب ہوا کہ مسجد ثمانیں کو کیا تخصیص ہے کہ شیخ وہاں فجر کی نماز ادا کرنے کو گئے تھے۔ اس کا راز دریافت کرنے کے لیے اس نے ادب کے ساتھ پوچھا کہ حضرت ہر روز نماز کے لیے مسجد میں تشریف لے جاتے ہیں؟

شیخ: (بے پرواہی سے) نہیں۔ صرف آج چاگیا تھا۔

حسین: تو شاید کسی کام کے لیے ادھر تشریف لے جانے کا اتفاق ہوا ہو گا۔

شیخ: (ذر ابرہمی سے) لواجھ سُو ان رموزِ معنی کے پیچھے نہ پڑنا چاہیے۔ اگر سچا شوق ہے تو کبھی خود ہی سارا راز کھل جائے گا۔ اب حرف سوال تیرے منہ سے نکل ہی گیا تو لے بتا دیتا ہوں۔ سن اجو لوگ خدا کے انوار از لی و سرمدی کا انعقاد کا س اپنے دل پر کرتے ہیں، ان کی آنکھوں سے حباب کا پردہ اٹھ جاتا ہے اور جہاں جہاں وہ نور ال انوار اپنی کرنیں ڈالتا ہے، وہاں آنکھوں کی شعاعیں بھی پہنچ جاتی ہیں۔ میرا جسم مادی اسی خانقاہ میں تھا مگر ان آنکھوں کی شعاعیں کوہ البرز کے پہلوؤں میں تھیں، جب زمرد کی تصویر تیرے سامنے اور میری جستجو تیرے دل میں تھی۔ پھر یہ شعاعیں اس تیرہ تاریخ خانے میں تھیں جہاں یوسف و یعقوب کے چہروں کے درمیان تو زمرد کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے تیری اس بے کسی کو دیکھا جب تو شہر غلیل کے مجاوروں کے ہاتھ میں اسیر تھا۔ تیری مدد کے لیے میں نے اپنے دوستوں کو بھیجا جنہوں نے شہروالوں پر حملہ کر کے تجھے ادھر آنے کا موقع دیا۔ یہ کہتے وقت شیخ کی آنکھیں اس تیزی سے چمکیں کہ حسین بالکل تھو نہ کرسکا اور شیخ کے قدموں پر سر

رکھ کے مجد و بانہ جوش کے ساتھ کہنے لگا:

”آپ سب جانتے ہیں۔ کوئی راز آپ سے پوشیدہ نہیں۔ میری آرزو اور تمنا بھی آپ کو معلوم ہے۔“

شیخ: (جو شوخی سے) سب جانتا ہوں، مگر اس کے اظہار کا وقت نہیں آیا۔ اس شوق کا تیری زبان سے ظاہر ہونا کسی خاص وقت، خاص حالت و کیفیت پر موقوف ہے۔ بس اب اس وقت خاموش رہنا چاہیے۔

یہ حکم سن کے حسین اس قدر مرحوم ہوا کہ میں پر پڑ کے کانپنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد شیخ نے اسے انٹھا کے بٹھایا، سینے اور آنکھوں پر اپنا دست بر کرت پھیر کے اُس کے دل کو تسلی دی اور کہا ”حسین! تو میری خانقاہ میں اور خاص میری صحبت میں رہا کر۔ اور جس قدر زیادہ خدمت کرے گا اور جس مستعدی سے بے عذر و تجھت میرے احکام کی، جو دوراصل احکام الہی ہیں، تعمیل کرے گا، اسی قدر جلد کامیاب ہو گا۔ مگر یہ خوب سمجھ لے کہ ابھی تیراظرف اور تیراول اس قابل نہیں کہ تو حاتم ربانی اور انقلاب قدرت کے اسباب و عمل سمجھ سکے۔ موسیٰ اور حضر کا قصہ ہر وقت پیش نظر رکھا اور یقین کر لے کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ نتائج ہمیشہ باطن میں مخفی ہوتے ہیں۔ ظاہر پرست رموز قدرت کو نہیں سمجھ سکتے۔ سزا اور جز اروح کے لیے ہے جو باطن پر متصرف رہتی ہے اور ہمیشہ دل کے اندر اور نیت پر حکمران ہے۔ یہ ظاہری ارکان و جوارج اتنی مادے میں مل جائیں گے اور نہیں رہیں گے۔ لہذا ان حرکات کا کوئی اعتبار نہیں۔ وہ قاضی و مفتی جاہل ہیں، نور الانوار یعنی دانی سے دور ہیں، جو ظاہری افعال و حرکات پر حکم دیتے ہیں۔ خضر و موسیٰ“ کے قصے میں اُس لامہوت اکبر نے موسیٰ کی تائید نہیں کی جو ظاہر پرستی کر رہے تھے۔ بلکہ حضر کو موافق فیصلہ کیا جو رموز باطنی اور راز اخفا

کو سمجھ رہے تھے۔ اسی طرح دیکھو ابراہیم نے بی بی کو بہن بتایا تو ظاہر پرست بہت گھبرائے کہ پیغمبر کی عصمت میں فرق آ گیا۔ یہ ان کی جہالت ہے، خدا ابراہیم کے دل کو دیکھ رہا تھا۔ الحال اے حسین! تو خوب سمجھ لے کہ ہر ظاہر کا باطن ہے اور خدا باطن کا طرفدار ہے، تجھے شیخ اور مرشد کی اطاعت آ نکھیں بند کر کے اسی طرح کرنا چاہیے جیسی اطاعت کی خواہش خضر نے موئی سے کی تھی۔

حسین: (سینے پر ہاتھ رکھ کے) بے شک میں ایسی ہی اطاعت کروں گا۔ مگر کیا معاصلی اور بُرے کاموں کے لیے بے سمجھے ارتکاب کر لیما چاہیے؟

شیخ: (نہایت جال کے ساتھ اور آ نکھیں سرخ کر کے) کیا تجھے یہ مان ہے کہ مرشد بُرے کام کا حکم دے گا؟

حسین: (ڈر کے اور اخلاقی کمزوری کی شان سے) لیکن ممکن ہے کہ مرید اور عقیدت کیش کو وہ فعل گناہ نظر آتا ہو۔

شیخ: ہاں، ممکن ہے، مگر اس کا باطن گناہ نہیں اور نتائج صرف باطن پر مرتب ہوتے ہیں۔

حسین: مگر اسی باطن پر جو مرتب اور کرنے والے کے دل میں ہو۔ میں ایک فعل کا ارتکاب کروں تو اس کے نتائج اسی نیت پر مرتب ہوں گے جو میرے دل میں ہے۔ اگر مجھے اس کا باطنی رخ اچھا نہیں معلوم ہو گا تو خواہ خواہ میری نیت بھی بری ہو گی۔ اور جب میری نیت بری ہو گی تو نتیجہ بھی اس نیت کے مطابق بُرا ہونا چاہیے۔

شیخ: (جو شیخ میں آ کے اور آ نکھیں سرخ کر کے) تو کیا تیرے نزدیک شیخ کی نیت پر شبہ کیا جاسکتا ہے، اور اس سے پہلے راز ہوتی کے تسلیم کرنے سے تجھے انکار ہے؟

حسین: (شیخ کے قدموں میں گر کے) ہرگز نہیں، مگر میری باتیں محض اس لیے ہیں کہ قلبِ عین  
قلبی۔ خداوندوہ دن نہ لائے کہ میں شیخ کی نیت پر بُجھپہ کروں۔

یہ جواب سن کر شیخ نے حسین کو اٹھا کر سینے سے لگایا اور اس کی پیٹھ پر شفقت کا ہاتھ پھیر کے کہا ”  
سُن! بے شک تیرے دل میں شکوک آتے ہوں گے۔ مگر اس راہِ باطن میں جو قدم آگے بڑھائے گا  
، تجھے نظر آئے گا کہ مُر ید کی وقعت کیا ہے۔ سُن! اُمر یہ ابعادِ ایک تلوار ہے جس کے قبضے میں شیخ کا  
ہاتھ ہے، اور تو سمجھ سکتا ہے کہ تلوار پڑے اور جس کا سر چاہے اڑا دے۔ مگر الزام یا ظلم کی نسبت  
تلوار سے نہیں کی جاسکتی، مگر یہ چیزیں اسی طرح منسوب ہوتی ہیں جو تلوار کو ہاتھ میں لیے ہو۔ یقین  
ہے کہ اب تیرا شکِ رفع ہو گیا ہو گا اور تو سمجھنے لگا ہو گا کہ مُر ید کے انعام کا باطنی پہلو شیخ کی نیت  
سے متعلق ہے، نہ کہ خود مُر ید کے ارادے سے۔ جب اس طرح اطاعت و مستعدی دکھا کے انسان  
ارادت کے مدارن طے کر چلتا ہے، اس وقت اعلیٰ درجے پر پہنچتا ہے۔ لیکن جب تک وہ ارادت  
کے درجے طے کر رہا ہے، اس کے ارادوں اور اس کی نیت کا کوئی اعتبار نہیں۔ اس وقت تک اس  
کے فعل کا ذمہ دار شیخ اور مرشد ہے۔

حسین: (جو شوہ و خوش سے شیخ کا ہاتھ چوم کے) بے شک بجا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے  
سے حقیقت کا پردہ اٹھ گیا اور مجھے کسی حکم کی تعمیل میں غدر نہ ہو گا۔

شیخ: حسین! اُمر یہ کے سر پر بڑی نازک ذمہ داری ہے۔ اس سے زیادہ نفسِ گشی کیا ہو سکتی ہے  
کہ انسان اپنے دل اور اپنی عقول کو اپنے انعام سے بالکل الگ رکھے۔ مگر تو غور کرے گا تو معلوم  
ہو جائے گا کہ یہ احکامِ الہی اور فتار زمانہ کے بالکل موافق ہے۔ جن کاموں کی تعمیل خضر نے کی  
اور جن میں موسیٰ کی مددی، ان کا باطنی پہلو صرف خضر کے دل میں تھا اور موسیٰ کی نیت میں وہ قطعی

معاصلی نہ تھے۔ مگر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ موسیٰ نے گناہ کیا اور اتنے بڑے بڑے کبیرہ گناہوں میں شریک ہوئے۔ ایسا اس لیے کہ اس عالم باطنی میں خضر مرشد اور موسیٰ مرید تھے۔ اس کی تعقیل خود ظاہر پرستوں میں روز ہوتی رہی ہے۔ طبیب بظاہر نہایت سمجھی دوادیتا ہے اور مریض اگرچہ اس کے منافع سے بے خبر ہے

مگر بااتا مل کھایتا ہے۔ ماں باپ لڑکے کو کسی کام پر مارتے ہیں۔ اُڑ کا اس کام کو دل میں اچھا سمجھ لیتا ہے۔ مگر ماں باپ اپنے دل میں اور اپنے ہی خیال کی مُضرت کی تمنا پر مارتے ہیں۔ اور اس کا نتیجہ ہر ایک کے نزدیک اچھا ہوتا ہے۔

یہ تقریر ایسی موہر تھی کہ حسین اس سے زیادہ سننے کی تاب نہ اس کا اور پھر ایک نہایت ہی بے خودی کی وضع سے جوش میں آ کے چلا یا ”بے شک! آپ بجا فرماتے ہیں۔ میرے دل کو اطمینان ہو گیا۔ میں کبھی بھی کسی حکم سے سرتاسری نہیں کروں گا۔“

اس علم غیب اور اس مدلل تقریر نے حسین کو شیخ علی وجودی کا ایسا اگر ویدہ بنادیا کہ اُس کی نظر میں سوائے شیخ کے اور کسی چیز کی ہستی نہ تھی۔ اُس کے کافوں میں ہر وقت شیخ کی آواز گونجتی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ہر گھری شیخ کی تصویر پھرتی اور اس کے دل میں ہر لحظہ شیخ کے احکام کا انتظار رہتا۔ زمرد کی تصویر بھی اب اس طرح پیش نظر نہ تھی بلکہ کبھی خانقاہ کے جھرے میں لیٹ کے وہ زمرد کے خیال کی طرف متوجہ ہو کے کہتا۔ پیاری زمرد! مجھے تو نے کہاں بھیجا ہے کہ خود مجھے بھووا جاتا ہوں۔“

الغرض اب پورے کمال کے ساتھ اسے فنا فی الشیخ کا درجہ حاصل تھا۔ اس کو ارادت و عقیدت مندرجی کے ساتھ شیخ کی خدمت کرتے بارہ مہینے گور گئے۔ اس زمانے میں ایک مرتبہ تین مہینے کے لیے

غائب رہے اور کسی ایسے سفر پر گئے جس کا انہوں نے بالکل راز میں رکھا۔ حسین ان کی غیبت میں بھی خانقاہ میں رہا۔ مگر اتنی مدت میں اسے معاوم ہو گیا کہ شیخ علی وجودی کے مُرید و معتقد یعنی کن کن شہروں میں اور کتنے کتنے پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا معمول تھا کہ سال میں ایک مرتبہ دور دراز کا سفر کر کے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور نئے نئے عجیب و غریب ادکامات سن کروالپس جاتے۔ جن کی فوری تعییل ہوتی۔ ایک طرف خراسان، مکران، سیستان، فارس، رو دبار آذربائیجان، عراق عرب اور عراق عجم کے مُرید آتے اور دوسری طرف عثمان، حضرموت، حجاز، یمن، زنجبار، مصر، طرابلس، الغرب، الجزیرہ اور تمام علاقہ افریقہ اور آشیانے کو چک کے معتقد۔ یہ سب لوگ مختلف وضع و لباس میں ہوتے اور پوشیدہ اکثر راتوں کو دیکھتا کہ شیخ کے خوشہ چین اور ارادت مند کن کن اقطا عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور اتنے بڑے اثر اور حکومت کے ساتھ بظاہر وہ کس سادگی اور بے نفسی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔

ایک رات شیخ کے گردوس مریدوں کا مجمع تھا۔ حسین بھی نہایت ادب کے ساتھ ایک کونے میں بیٹھا تھا اور شیخ کی زبان فیض ترجمان بہت بڑے بڑے رموز حکمتی و روحانی کھول رہی تھی۔ ایک شخص نے جو مصر سے آیا ہوا تھا، ادب سے مگر شک کرنے کے لمحے میں کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا، انسان جب اس جسمِ خاکی کو خاکدان میں چھوڑ جاتا ہے تو جنت کی سرتوں میں اُسے کیوں لطف آتا ہے“۔

اس کے جواب میں شیخ نے کسی قدر برہمی سے کہا ”بعینہ اس طرح کہ تم دنیا میں اس جسم کے ساتھ مزے اڑاتے ہو“۔

حسین: کیوں کر ہو؟ اللہ اور درتو صرف جسم کے موافق سے ہیں۔

شیخ: (ذر اجوش میں آ کے) زوح گوب جسم ہوتی ہے مگر اسے معلوم یہی ہوتا ہے کہ گویا جسم میں  
ہے۔

شخص: یہ کیوں کر سکتا ہے؟ جب ماڈے کی کشافت ہی نہیں تو اسے متشکل اور متغیر کون چیز کر سکتی  
ہے؟

یہ سُن کے شیخ کی براہمی اعتدال سے زیادہ ہو گئی۔ انہوں نے حسین کو پکار کے قریب بُلا یا اور کہا ” بتا! ”  
تو جب کوہ البرض کی گھائی، کوہ جودی کے غار اور شہر خلیل کے تیرہ و تارہ خانے میں تھا، اس وقت  
میرے وہاں موجود ہونے اور تیری ہر حالت سے باخبر رہنے کا تجھے یقین ہے؟

حسین: (سینے پہ ہاتھ رکھ کر) بے شک، گویا میری ناتوان آنکھیں نہ دیکھتی ہوں، حضرت کا جلوہ  
ضرور موجود تھا۔ ورنہ ممکن نہ تھا کہ وہاں کے روز آپ کو معلوم ہو سکتے۔

یہ سُن کے شیخ نے ذرا فخر و ناز کی شان سے ارد گرد کے لوگوں کو دیکھا اور سب کے بعد اس شخص کے  
چہرے پر جس نے یہ شک کیا تھا اپنی تیز نظریں جمادیں۔ مگر اس کے دل کو ابھی اطمینان نہیں ہوا تھا  
۔ وہ شیخ علی وجودی کی اتنی براہمی دیکھ کچنے پر بھی معتبر ضانہ طریقے سے بول آئا ” بے شک آپ  
وہاں موجود ہوں گے اور حسین کی ہر حالت کو دیکھ رہے ہوں گے۔ مگر صرف آپ کی روح تھی اور  
متشکل نہیں ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو حسین آنکھوں سے بھی آپ کے نورانی جمال کو دیکھ لیتا۔ ”

یہ سنتے ہی شیخ کوتا ب نہ رہی۔ زور میں آ کے کھڑے ہوئے، آنکھوں کی چمک دو چند ہو گئی، منہ  
میں کف بھرا آیا، اور اس شخص کی طرف دیکھ کر کہا ” یہ جسد ناپاک نہایت ہی سرکش ہے یا روح  
نو رزال انوار کے شہزادہ وجود کو نہ سمجھ سکتی ہے اور نہ سمجھنے کی کوشش کرتی ہے۔ کسی کو یہ راز بھی معلوم نہیں  
کہ دنیا کیوں ہے اور یہ روح اس پنجربہ خاکی میں ایک مدت تک کیوں قید رکھی جاتی ہے۔ اس کا

راز مجھ سے سنو! میں وہ شخص ہوں کہ جو سر و شہدا ن اور عالمِ اہوت کا ایک آن میں دورہ کر آتا ہوں اور ان روز کو جو عرشِ اعلیٰ کے اطراف میں لکھے ہیں، پڑھ آتا ہوں۔ اصل یہ ہے کہ جسم میں آنے سے پیشتر روئے مجرز دیں صلاحیت نہیں ہوتی کہ کسی مادی مسرت سے لطف اٹھا سکے۔ اس وقت وہ شخص مجرز ہوتی ہے اور حظوظ ولڈائز سے فائدہ یاب ہونے کے طریقے سے بالکل بے خبر۔ صرف اسی چیز کا سبق لینے کے لیے وہ اس جسم خاکی میں رکھی جاتی ہے۔ وہ مدد و دزمانہ جسے تم زندگی کہتے ہو اور ہم روحوں کے کمال حاصل کرنے کا مدرس، اس لیے ہے کہ روزِ لطیف اس مقام کے ساتھ علاقوں پیدا کر کے ہر قسم کی لذتوں اور ہر قسم کے المون سے اتنی آشنائی پیدا کرے کہ اس سے عاحدہ ہونے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو متھیر و متشکل اور لذت والم سے متأثر کر سکے۔ جس طرح کوئی شخص مدارجِ روحانی طے کرنے کے بعد یہ صلاحیت اور قوت حاصل کر لیتا ہے کہ روزِ اس کے جسم میں رہنے کی حالت میں بھی اپنے آپ کو غائب یا روزِ غیر متشکل و غیر متھیر بنالے، اسی طرح روزِ انسانی عموماً اس جسم خاکی کے حجرے میں بند ہو کے اتنا چلہ کھینچ لیتی ہے کہ اس کے چھوڑ دینے کے بعد بھی جب چاہے اپنے آپ کو جسم اور شکل میں ظاہر کر دے۔ پھر اس کا کمال اس درجہ پر ہے جائے۔ بہت سے باکمال بزرگوں اور شہیدوں کو سنا ہو گا کہ ان کے جسم تو قبر کے کونے میں پڑے سڑ رہے تھے مگر روحِ اکثر لوگوں کی نظر کے سامنے اپنی ہی یا کسی دوسری شکل میں نمودار ہوئی۔ صرف ایک روز ہے جس نے بغیر جسم میں آئے اس کمال کو حاصل کر لیا۔ اس سے مراد جبرائیل ہیں جو کبھی وجہہ کلبی اور کبھی دیگر پیکروں میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے نمودار ہوئے۔ مگر اس کا راز جانتے والا اس عالم میں سوائے میرے کوئی نہیں کہ جبرائیل نے یہ کمال روحی کیونکر حاصل کیا۔ سنو! مسیحؐ کی ولادت کا اسی زمرے سے تعلق ہے۔ یہ جبرائیل تھے جو مریم

صلی اللہ علیہ وسلم کے جسم میں حلول کر کے مسیح کی صورت میں متغیر ہوئے اور تھوڑے زمانے میں اپنا روحی  
کمال حاصل کر کے چلے گئے۔ مسیحیوں کو دھوکا ہوا کہ خدا تعالیٰ مگر نہیں، صرف ایک روح تھی جو ایک  
جسم سے جس میں دوسری روح بھی موجود تھی، کمالاتِ جسمانی حاصل کر کے آسمان پر چلی گئی۔ مسیح  
کی روح ایک دوسری روح تھی جو ان کے جسم میں تھی، مگر اسی کے ساتھ جبرائیل کی بھی ان کے پیکر  
میں اُتر کے چند روز ہی میں مسیح کے جسم میں الوہیت کی شان نمودار کر کے غائب ہو گئی۔ مُردوں کا  
زندہ کر دینا یہ مسیح کا کام نہ تھا بلکہ صرف جبرائیل کی ملکوتی ثبوت کا مشہور اور مسلم نتیجہ جس کا لوگوں کو  
موسٹی کے لیے مشاہدہ ہو چکا تھا۔ مگر جن کو خدا نے پیشہ میں دی، آج بھی نہیں سمجھ سکتے اور مسیح  
کے اس معجزے کو یاد کر کے پریشان ہوتے ہیں۔ الغرض یہی متغیر و متشکل ہو سکنے کا کمال ہے جس  
کے حاصل کرنے کے لیے ہر روح دنیا میں آئی ہے۔ اور یہاں سے جانے کے بعد اسی کمال کے  
مطابق جنت دوزخ میں اپنے کردار کا جزا و ثواب پاتی ہے۔ تم میرے کمالات سے ناواقف ہو۔  
میں وہ شخص ہوں کہ خود ہی نہیں، ہر شخص کو اس مالاِ عالیٰ پر پہنچا کے وہاں کی ہر چیز دلکھا سکتا ہوں اور  
میرے اختیار میں ہے کہ جنت کے روحانی پیکروں کو اس جہنم خاکی کے سامنے لا کھڑا.....

شیخ نے یہیں تک کہا تھا کہ حسین روتا اور التجا کرتا ہوا ان کے قدموں پر گرا اور کہا ”یا حضرت! مجھے  
مسکے میں شک نہیں۔ مگر اتنی تمنا ہے کہ اس سر و شبتان اور جنت میں ہواؤ۔ وقت ہو گیا کہ اپنی  
التجا آپ کے سامنے پیش کروں اور یقین ہے کہ محروم نہ رہوں گا۔“

حسین دیر تک شیخ کے قدموں پر پڑا روتا رہا مگر شیخ اس قدر رجوش میں بھرے ہوئے تھے کہ چند  
ساعت تک خاموش کھڑے رہے، پھر اس کو انھا کے بٹھایا اور کہا ”حسین! میرے اس وقت کے  
رجوش سے تو نے بڑا فائدہ اٹھایا۔ خیر، اب اس وقت تو تامل کر۔ کل تہائی میں پھر درخواست کرنا۔“

بے شک وقت آگیا ہے کہ تجھے اس محنت و ریاضت کا پھل ملے۔ مگر ابھی تیرا متحان باقی ہے اور سخت امتحان۔ مجھے دیکھنا ہے کہ تو نے کہاں تک اپنے آپ کو مرشد کے ہاتھ میں دے دیا ہے۔ اور یاد رکھ کر جس قدر تجھے مرشد کا حکم بجا لانے میں تامل ہو گا، اسی قدر را پنا مقصد حاصل کرنے میں دیر ہو گی۔

سب مرید رخصت ہو کے چلے گئے۔ حسین بھی اس بچھو نے پر لیٹا۔ مگر یہ رات اس نے نہایت ہی انتظار و اضطراب میں گزاری۔ اس لیے کہ آتش شوق تیز تر گرد و کامضمون تھا۔ صبح کو نماز کے بعد جیسے ہی شیخ علی وجودی نے وظیفے سے فراغت پائی، حسین ان کے قدموں پر گر پڑا اور چلا یا：“اب زیادہ صبر کی تاب نہیں۔ آپ کو سب حالات خود ہی معلوم ہوتے ہیں، مجھے کہنے کی بھی ضرورت نہیں۔ مگر خدا کے لیے زمرد سے جلدی ملا یے،”

شیخ: بہتر تو زمرد سے ملے گا۔ اس کے وصل سے کامیاب ہو گا۔ مگر اس کے لیے اچھی طرح تیار ہے؟

حسین: دل و جان سے تیار۔

شیخ: دیکھو، تجھے تامل نہ ہو۔

حسین: ذرا نہیں۔

شیخ: تیرے دل میں شک اور بد عقیدگی نہ پیدا ہو۔

حسین: نہیں، ہرگز نہیں۔

شیخ: وہ جرأت کا کام ہے۔

حسین: میں جان لڑا دوں گا۔

شیخ: اس میں خطرے بھی ہیں۔

حسین: ہوں۔

شیخ: تو سن!

حسین: ارشاد؟

شیخ: ابھی نہیں۔ دل مضبوط کر لے۔

حسین: خوب مضبوط ہے۔

شیخ: مجھے معلوم ہے کہ تو نے کتب درسیہ امام نجم الدین غیاثا پوری سے پڑھی ہیں اور انھی کا تو میر یہ بھی ہے۔

حسین: (حیرت سے) بے شک، ہوں۔ پورے پانچ سال ان کے حلقوں درس میں شریک رہا۔

شیخ: تیرے دل میں ان کی کتنی وقت ہے؟

حسین: تمام عالم میں آپ کے بعد بس انھی کو بڑا عالم و فاضل، بہت بڑا خدا شناس اور سب سے زیادہ مشقی و پر ہیز گار سمجھتا ہوں۔

شیخ: خیر، تو جا۔ ان کے جلے میں پھر شریک ہو اور جس وقت موقع ملے، ان کو قتل..... شیخ کی زبان سے صرف اتنا ہی انکا تھا کہ حسین نے ایک چیخ ماری اور بے ہوش ہو گیا۔



## ملا علی کا سفر

امام جنم الدین نیشا پوری اس عباد کے بڑے امام تھے۔ تمام زمانے میں ان کی نیک نفسی اور علم و فضل کی شہرت تھی۔ شاہزاد کوئی مقام ہو گا، جہاں ان کے شاگرد مسلمانوں کی ایک بڑی جماعت کی مقتداً تھی نہ کہ رہے ہوں وہ حسین کے استاد مرشد ہی نہیں بلکہ پچھا بھی تھے۔ ان کا اصلی وطن شہر کابل میں تھا۔ چھوٹی ہی عمر میں طلب علم کے شوق میں گھر سے نکل گئے تھے۔ دنیا کی بڑی بڑی درس گاہوں میں شریک ہو کے بغداد پہنچے۔ ایک مدت دراز تک مدرسہ نظامیہ کی طالب علمی کی۔ پھر مشرقی باد کی سیاست میں مشغول ہوئے۔ بخارا و ہرات کی علمی صحبتوں میں شریک ہوئے اور وہاں کے علماء کی درس گاہوں سے خوش چینی کر کے نیشا پور میں آئے اور وہیں متوطن ہو گئے۔ اب ان دونوں علم و فضل کے بڑے مرکز اور خداشناسی کے نامور قطب بنے ہوئے تھے۔

حسین نے ایک ایسے نیک نفس اور باحداعزیز کے قتل کرنے کا حکم سننا تو یہاں کچھ ایسی حیرت و پریشانی ہوئی کہ بے ہوش ہو گیا۔ شیخ علی وجودی نے اسے ہوش میں لانے کی تدبیر نہ کی بلکہ اسی طرح زمین پر پڑا رہنے دیا۔ تھوڑی دیر تک وہ انتظار کرتے رہے کہ حسین خود ہی ہوش میں آ کے حکم بجا لانے کا وعدہ کرے۔ مگر جب اسے ہوش میں آنے میں دیر ہوئی تو اسی طرح چھوڑ کے ایک دوسرے حجرے میں چلے گئے۔ شاید دو گھنٹے میں حسین کو ہوش آیا اور اس کے ساتھ ہی شیخ کا واجب انتقال حکم بھی یاد آیا۔ قریب تھا کہ دریائے غفلت میں پھر ایک خوطہ لگائے، مگر سنجدہ اور اٹھ کے چاروں طرف دیکھا۔ شیخ علی وجودی غائب تھے اور تنہا وہی تھا۔

گزر شستہ باتوں کو یاد کر کے حیرت کرنے لگا ”کیا مجھے شیخ کی بات سمجھنے میں غلطی ہوئی؟“ بے شک ایسا

ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے نیک نفس اور حقیقت ہیں شیخ نے تو اس قسم کے سخت خلُم و گناہ کا حکم نہ دیا ہو گا۔ مجھے قتل عمد کی ہدایت، اور قتل بھی کس کا؟ شیخ نجم الدین غیثا پوری کا جن سے بڑا عالم فاضل اس وقت صفحہ ہستی پر نہیں۔ یقیناً مجھ سے غلطی ہوئی۔ مگر فرض کر لیا جائے کہ شیخ نے یہی حکم دیا ہے تو بھی یہ مجھ سے نہ ہو سکے گا کہ اپنے پیر و مرشد اور باخدا پچھا کو قتل کر ڈالوں۔ (کانپ کر) بہت مشکل معلوم ہوتا ہے۔ دنیا کیا کہے گی؟ اور پھر دین میں بھی توبے کہ من قتل مُؤمناً مُعْمَد افتقہ لفڑاں حکم کو بجا لے کے سوا اس کے رو سیاہی دارین حاصل کروں اور کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ نحسر اللہ نیا و الآخرۃ کے سوا اور کچھ نہیں۔ لیکن ہاں، شیخ نے کہا تھا کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔ اس میں بھی کوئی فائدہ ضرور متصور ہو گا۔ حقیقت میں وہ رسویٰ قدرت جانتے ہیں۔ امام نجم الدین شیخ علی وجودی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور نہ خیال میں آتا ہے کہ شیخ علی وجودی کی نیت بُرمی ہے۔ کوئی تعجب نہیں اگر کسی روحانی مصلحت سے انہوں نے بظاہر ایسے مکروہ کام کا حکم دیا ہو۔ واقعی اگر یہی حکم ہو تو مجھے تامل نہ کرنا چاہیے۔ یہ میرا پہلا امتحان ہے۔ اگر ذرا بھی عذر کیا تو گناہ گار بھی ہوں گا اور زُمرد کے وصال سے بھی محروم رہوں گا۔ اس تعمیل حکم میں دینی فائدہ تو بد یہی ہے۔ کیونکہ شیخ کا امر واجب الاذعان ہے۔ باقی دنیاوی بدنامی تو اس کی ہستی نہیں۔ اگر کسی قدر ہے تو اس کے عوض میں کتنا بڑا فائدہ ہے کہ پیاری زمرد کی ہم کناری اسی زندگی میں نصیب ہو جائے گی۔ ”دل میں یہ خیال جما کے حسین حجرے سے لکا اور مختلف حجروں میں ڈھونڈتا ہوا اس حجرے میں جا پہنچا جہاں شیخ علی وجودی تھے۔ اُن کی صورت دیکھتے ہی قدموں پر سر رکھ دیا اور چلایا۔“ مجھے وہ حکم یاد نہیں رہا۔ جلدی بتائیے کہ تعمیل کو روانہ ہوں۔“

شیخ: دیکھو! اب کے تامل نہ ہو۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دل میں بدگمانی پیدا ہوا اور تم اپنی

ساری محنت صاف کر دو۔ خوب یاد رکھو کہ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے۔

حسین: خوب یاد ہے، اور مجھے ذرا تامل نہ ہو گا۔

شیخ: تو جاؤ، امام نجم الدین غیثا پوری کو قتل کر دو۔

حسین: (دل مضبوط کر کے) بہتر۔ لیکن اگر میں مارڈا الگیا؟

شیخ: کوئی مصائب نہیں۔ بلاز جمیت زمرد سے جا ملو گے۔ مگر مجھے معاوم ہے کہ ایسا نہ ہو گا۔

حسین: تو میں رخصت ہوتا ہوں۔

شیخ: ٹھہرو (ایک تیز خبر نکال کر) اس خبر کو اپنے پاس چھپا کے رکھو۔ جس وقت موقع ملے، اس سے کام لیما۔

مرشد کا عطا کیا ہوا خبر لے کر حسین نے اپنے استاد کی جان لینے کو شرق کی راہ لی۔ ڈیرہ ہمہ مہینے بعد بغداد پہنچا۔ وہاں سے چل کے اصفہان اور اصفہان سے ایک مہینے بعد غیثا پور پہنچ گیا۔ حاب سے نکلے چار مہینے ہوئے تھے کہ امام نجم الدین کی درس گاہ میں حاضر ہو گیا۔ امام موصوف پہچانتے ہی بغل گیر ہوئے اور بے انتہا شفقت سے پیش آئے۔

گھر کے خطوط سے انھیں یہ خبر معلوم ہو چکی تھی کہ حسین ایک شریف لڑکی کو ساتھ لے کے بدنامی کے ساتھ نکل گیا ہے، جس کا تذکرہ کر کے انہوں نے افسوس کیا اور کہا ”حسین، مجھے ایسی امید نہ تھی کہ علم کو اس ذوق و شوق سے حاصل کر کے تم اس کی بُخْر مرتی کرو گے۔“

حسین: یا گُم! میں کسی بری نیت سے نہیں لے گیا تھا۔ زمرد کا عقد میرے ہی ساتھ ہونے والا تھا

اور وہ حج کی بے انتہا مشتاق تھی۔ اس علم دین کی وجہ سے مجھے ناگوار ہوا کہ اس کی دینی خواہش کا

خیال نہ کروں۔ بے تامل ساتھ لے کر چل لکھ رہا ہوا۔

امام: اور اب وہ کہاں ہے؟

حسین: جہاں طالقان کی گھاٹیاں ہیں۔ پر یوں کے ہاتھ سے مارڈاں گئی۔

امام: (مسکرا کر) ایسا مہمل اور بے سرو پا قصہ بنانے سے کیا حاصل۔ اسے کوئی تسلیم ہی نہیں کرے گا۔

حسین: جس بے تکلفی سے میں نے یہ قصہ بیان کر دیا ہے، اسی سے آپ اندازہ فرماسکتے ہیں کہ میرے بیان میں کسی بناوٹ کا داخل نہیں۔

امام: خیر، اب یہاں کس غرض سے آئے ہو؟

حسین: آپ کے حلقة درس میں شامل ہونے کے لیے۔ زمرد کے غم میں میں نے ارادہ کر لیا ہے۔

کے علاوہ دنیوی کوچھوڑ دوں اور چاہتا ہوں کہ باقی ماندہ زندگی تحریک علم ہی میں صرف ہو جائے۔

امام: اگر ایسا ہے تو خدا تمہارے ارادے میں برکت دے اور تمحییں تو فیق ہو کہ میرے بعد اس درس گاہ کے مالک بنو۔

الغرض حسین، امام نجم الدین کے خوشہ چینوں میں شامل ہو گیا۔ اور چونکہ بھیجا تھا، ان کے دل میں روز بروز اپنا زیادہ اعتبار پیدا کیا۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ اپنا موقع بھی ڈھونڈ رہا تھا۔ امام کثرت اوقات طلباء اور معتقدین کے مجمع میں رہتے جس کی وجہ سے تین مہینے گزر گئے اور حسین کو خبر نکالنے کا موقع نہ ملا۔ چوتھے مہینے میں کچھ ہی دن گزرے تھے کہ اتفاقاً امام کوششہت سے بخار آیا اور کئی دن تک درس و تدریس کا سلسلہ موقوف رہا۔ اس بیکاری کے زمانے میں اکثر طلباء تو ادھر ادھر پھرتے

ربے مگر حسین نے امام کی تیمارداری میں انہا سے زیادہ گرم جوشی اور سعادت مندی دکھائی۔ شب و روزان کی دلکشی بھال اور خدمت گزاری میں مصروف رہا۔

امام کو بخار آئے چھٹا دن تھا کہ ایک رات کو اتفاقاً قآن کے جھرے میں اکیلاً حسین ہی تھا۔ رات زیادہ ہو چکی تھی اور امام پچھونے پر لیٹے ناتوانی کی آواز میں اس سے با تیس کر رہے تھے۔ حسین خلاف معمول آن خاموش تھا۔ ان کی باتوں پر ہونکاری تو ضرور کرتا جاتا تھا مگر اس کے سوا کوئی اور لفظ زبان سے نہ نکلتا تھا۔ کئی مرتبہ امام کو تعجب ہوا بلکہ کئی مرتبہ پوچھنے لگے کہ آن تم خاموش کیوں ہو؟ مگر حسین نے ”یوں ہی“ کہہ کے ٹال دیا۔ اور باہر نکل کر تاروں سے دریافت کرتا تھا کہ رات کتنی آئی۔ آخر آدمی رات گزر گئی اور حسین کو اطمینان ہو گیا کہ اب صبح تک کوئی نہ آئے گا۔ اس بات کا یقین کر کے اس نے جھرے کا دروازہ خوب مضبوطی سے بند کر لیا اور پاس جا کے دیکھا اور امام کی بھی آنکھ لگ گئی تھی۔ دیر تک کھڑا ان کی صورت دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا اور ساعت بہ ساعت اپنے استاد اور بزرگ پر کاری وار کرنے کے لیے زیادہ تیار ہو جاتا تھا۔ اس فتح کے خون ریز کاموں سے وہ بھی آشنا نہ تھا۔ دل کو زور دے دے کے ابھارتا تھا مگر خیالات ایسا پلان کھاتے تھے کہ بار بار ہمت بار دیتا۔ جھرے میں ہر طرف سے ایسی ایسی خیالی با تیس نظر آتیں اور ان کا ایسا رعب پڑتا تھا کہ معلوم ہوتا کہ جیسے فرشتہ یا کسی اور چیز کی غیر جسمانی مخلوق امام کی حفاظت کر رہی ہے۔ خود امام کا چہرہ اس کے خیال کی آنکھوں میں نہایت ہی نورانی بن کے۔ غارش کرتا اور کبھی بھیا نک اور مہیب نظر آ کے ڈر دیتا۔ مگر ان سب خیالات کو اس نے مٹایا، شیخ و جودی کا عطا کیا ہوا خجراں کے اس کی باڑھ دیکھی اور یکا یک دل مضبوط کر کے امام کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ امام نے چونک کر آنکھ کھولی تھی اور چلنا نے ہی کو تھے کہ اس کا بایاں ہاتھ ان کے منہ پر اور خجراں

کے دل میں تھا۔

چند ہی لمحوں میں امام کی روح پرواز کر گئی۔ خون تمام جھرے میں پھیلا ہوا تھا۔ بے جان لاش خون آلو دکپڑوں میں لپٹی ہوئی بستر پر پڑی تھی۔ اور گویا زور آوری کا کام نہ تھا۔ مگر حسین کے دل کو اتنی بڑی شدید حرکت ہوتی تھی کہ لکھڑا کا نپ رہا تھا اور بار بار اپنے ہاتھ کے معصوم شہید کی مظلومان لاش کو ڈرڈر کے دیکھتا۔ آخر اس نے ان سب چیزوں کو اسی حال میں چھوڑا، جھرے کے خوفناک منظر سے ہنسی ہوئی آنکھوں سے آخری نظر ڈالی اور دروازہ کھول کے انکا۔ جھرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا اور چپکے پہنچ کے قدم اٹھاتا ہوا چا۔ شاید زیادہ وقت نہ ہوا ہو گا کہ شہر کی خانقاہ سے دور نکل گیا۔ نیشاپور کے گرد نہایت ہی مضبوط فصیل تھی اور پھاٹک رات کو بند ہو جاتے تھے، جس کے سبب سے اس وقت اسے باہر نکلنے میں بہت دشواری نظر آئی مگر جان پر کھیل کر ایک تیرہ و تار بد روح کے ذریعے سے باہر نکلا اور نکتے ہی نہایت تیزی سے بھاگتا کہ صحیح ہونے سے پہلے ہی دور نکل جائے کہ کوئی اُسے پانہ سکے۔

دوسرے دن جب وہ شوق کے پیروں سے اُڑتا ہوا خراسان کے مغربی میدان اور جنگل قطع کرتا ہوا چلا جاتا تھا، اُس وقت اس کے حواس ڈرانگ کانے ہوئے اور ظلم و گناہ یاد آیا جو ہر پہلو سے بُرا تھا۔ اس خیال کے دور کرنے کی برابر کوشش کرتا تھا مگر بار بار زبان سے ایک آہ کے ساتھ جملہ نکل ہی جاتا تھا کہ میں بڑا گنہگار ہوں اور اس کا دل اور اس کا ایمان اس پر لعنت کرتا تھا۔ لعنت اور پھنکار کی آواز کان میں آتی تھی اور چونک چونک کر کہتا کہ اس فعل کے ذمے دار شیخ علی وجودی ہیں۔ مگر خود ہی دل میں تقابل ہو جاتا کہ امام کا کام تو میرے ہاتھ اور میری سنگدلی نے تمام کیا ہے۔ ذمہ داری کسی اور کے سر کیونکر جاسکتی ہے۔ اب کے دل نے شیخ کے اصول میں بھی شک پیدا

کیا کہ مرشد کے ہاتھ میں صرف ایک بے جان اور غیر ذمے دار آئے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ آپ ہی آپ کہنے لگا ”نہیں۔ علمائے روحانیں کا یہ مسئلہ اگر صحیح ہے کہ ثواب اور عذاب اسی لذت والم کا نام ہے جو اپنے کردار کے نتائج میں خود اپنے ضمیر اور دل کی تحسین و خلمت سے پیدا ہوتے ہیں تو انسان کے فعل کا دوسرا ذمے دار نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو کہ میں نے ایک کام کیا۔ اور گوہ کسی مشیر و صلاح کا رکے خیال میں اچھا ہو مگر میرے نزدیک بُرا اور قابل ملامت ہے، تو اس کے ارتکاب پر میرا دل مجھ پر ضرور اعنت کرے گا اور جب اسی اعنت کے عالم کو اصلاح شرح میں عذاب سے تعبیر کیا گیا ہے تو بے شک میں دوزخ اور عذاب سے نہ فوج سکوں گا۔

الغرض حسین کے دل نے اُسے قائل کر لیا۔ اب وہ پچھتا رہا ہے اور سخت روحانی تکلیف میں بتتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی شیخ علی وجودی کی وقعت بھی ویسی ہی دل میں موجود ہے۔ شیخ علی وجودی کی وہ ایسی کرامتیں دیکھے چکا ہے کہ ان پر بدگمانی نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعض اوقات ڈر جاتا ہے کہ شیخ غیب کے دلوں کے حالات سے واقف ہیں۔ میرے یہ شکوہ کہیں ان کو معلوم ہو گئے تو غضب ہو جائے گا۔ ادھر سے بھی جاؤں گا ادھر سے بھی۔ اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب کے بعد زمرد کے وصال سے محروم رہا تو حسرت ہی رہ جائے گی۔

حسین اسی لسم کے خیالات دل میں لیے نہادت کے دریا میں غرق اپنے فعل پر پچھتا تاہواشہر حلب میں داخل ہوا اور شیخ کے سامنے جاتے ہی قدموں پر گرنے کو ہی تھا کہ انہوں نے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور نہایت ہی جوش سے کہا ”حسین! تو اچھا امتحان میں پورا اُتر۔ اب زمر دیجھ سے زیادہ تیری مشتاق ہے۔ اس نور الانوار کے انوار ایزی نے تیرے دل پر پورا انعکاس کیا اور تیرے جسم کی اس مشت خاک نے یہ صلاحیت پیدا کر لی ہے کہ اس عالم نور اور سر و شہستان کی تجلیات کی متحمل ہو۔

لے گے۔

حسین: مگر یا حضرت! میرے دل میں اس ظالمانہ فعل کی نسبت طرح طرح کے شبہات پیدا ہوتے ہیں۔

شیخ: (جو شہنشاہ آنکے) بے شک پیدا ہوتے ہوں گے۔ روح اس مادے کی کثافت سے بڑی بڑی دشواریوں سے علاحدہ ہو سکتی ہے اور صرف یہی چیز ہے جو ان شکوک اور شبہات کو پیدا کرتی ہے۔ وہ مرکب اثراتی جو باوجود الاتی ہونے کے حیاتِ سرمدی کا چشمہ ہے، اس جسمانی روح پر جو نفسِ ٹھنڈری میں مقید ہے، اپنے تنوعاتِ عشق آشکار کر سکتا ہے۔

حسین: مگر اطمینان بخش نصائح ارشاد ہوں کہ دل سے شبہات نکل جائیں۔

شیخ: سُن اے حسین: استقلال تیرے شکوک کو دور کر دے گا بشرطیکا تو ان سے رفع کرنے کی کوشش کرنے میں مشغول رہے۔ مگر تیرے اطمینان کے لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں تکمیلِ نفس اتنی کامنا میں ہے اور یہی نشاۃ ثہیات کا ہے کہ روح کے تعلقاتِ جسم سے علیحدہ کیے جائیں۔ جسمانی افعال پر تصریف کرتے کرتے روح عادی ہو جاتی ہے کہ بلا استعانتِ مادہ کوئی کام نہ کر سکے اور وہ رو حسیں جو جسم کو چھوڑتے وقت انہی مادیات میں پھنس کر رہ گئیں، وہ بعد میں بھی ہر وقت خود کو مادے کے تیرہ و تار قفس میں پاتی ہیں۔ اور یہی چیز اصطلاحِ شرع میں ان کا دوزخ ہے۔ نجات کی کوشش یوں ہونی چاہیے کہ زندگی ہی میں روحی عائق جسم سے کم کر دیے جائیں۔ اس کوشش کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ جسم سے ایسے کام لیے جائیں جن سے روح کا تعلق نہ ہو۔ پیتا ب ہو کے ان کی طرف متوجہ ہو جانا چاہیے اور انسان بہادری و مضبوطی سے اسے جبرا رو کے۔ یہی ثہیات کی آئیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ روح ایسے کام کرے جن سے جسم کا تعلق نہ ہو۔ جواہر دور

دراز شہروں میں اپنی روح سے اثر ڈال دیا کرتے ہیں، ان کی نسبت سمجھ لینا چاہیے کہ وہ عالم روحانیات کے اس درمیانی فاصلے کو طے کر رہے ہیں۔ اس کے بعد تیسرا درجہ ہے کہ نفس جسم سے اپنی علاحدگی حاصل کرے کہ اس نور ال انوار کے انکشافات کی جستجو میں مادے سے مجبراً منزد ہو کے ملکوت اور عالم الا ہوت کی سیر کرے۔ اس اعلیٰ جستجو کے زمانے میں جو کوئی مر جاتا ہے وہ جسم خاکی کو الوداع کرتے ہی اس نقطہ اولیٰ وابدُ العدل سے جاتا ہے۔ اس وقت اسے وہ اعلیٰ کمال روحانی حاصل ہوتا ہے کہ جس کی تحریک کے لیے اس نے عالمِ مادی کی یہ قید اٹھا دی تھی اور خبستان کے مصائب میں مُبتلا ہوا تھا۔ اب اس کی یہ حالت ہوئی ہے کہ ایک طرف تو تعلقات جسمی کی مادی تعلیمات سے اس سے یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ جب چاہے اس عالم کے سامنے اپنے آپ کو تھیل و متشکل کر دکھائے اور دوسری طرف اس میں کمالِ روحانیت و تجزیہ اس درجے کا ہوتا ہے کہ جب چاہے اس نقطہ ازال اور اولیٰ مرکب نور ال انوار سے جا ملے۔ لہذا اے حسین! تو اس مدرسہ روحانیت کی ابتدائی جماعت میں ہے اور ابھی اس امر کی مشق کر رہا ہے کہ تیرے ارکان و جوارح سے ایسے افعال و حرکات صادر ہوں جن کی طرف تو منسوب کرے، یہ لعنت ملامت جو تیرا نفس اور تیری روح مجھ پر کر رہی ہے۔ یہ اسی تعلیقِ روحی کا نام ہے جس سے قطع کرنے کی کوشش مجھے کرنی چاہیے۔ اور جب تو یہ کمال حاصل کر لے گا کہ روح کو تیرے اعضاء کے کسی فعل کی طرف توجہ نہ ہو، اس وقت دوسرے درجہ تو حید میں قدم رکھے گا۔

حسین: تو میں ان انساموں اور ملامتوں کی پرواہ کروں جو خود میرے دل سے مجھ پر پڑ رہی ہے؟  
شیخ: ہرگز نہیں۔ اسی امر کی مجھے مشق کرنا ہے اور نور ال انوار کی طرف توجہ کرنی ہی پہلا زینہ ہے۔

حسین: حضرت! آپ اس خداوندِ جل و علی کو نور ال انوار کیوں فرماتے ہیں؟ اس کی رمز میں

نہیں سمجھ سکا۔ وہ حضرت رَبُّ الْعِزَّة بے شک نور بے مُگر الانوار کیوں؟

شیخ: (برہم ہو کے) وہ نقطہ وحدت اور سرچشمہ تکوین اس سے بالکل منزہ ہے کہ ہم اپنے ماڈی خیال کے صفات کو اس کی جانب منسوب کریں۔ اور وہ ایسا ہے کہ یہیں گئی مثلہ شنی۔

حسین: مگر خود اللہ جعل شانہ، نے ان صفات کو اپنی طرف منسوب کر لیا تو ہمیں کیا تأمل ہے؟  
شیخ: وجودی کی برہمی کی اب انتہا نہ تھی۔ انہوں نے حسین کو غضب آلو دا اور سرخ آنکھوں سے گھور کے دیکھا اور بولے:

”بے شک انسان ظُلُوم و جہوں ہے۔ یہ تیرے خیال میں نہیں آتا کہ ہم محض اُسی کے ارشاد کے بموجب ان صفات کو اس کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔ ہم اُسے نور کہتے ہیں، مگر چونکہ ہمارے خیال کے نور سے وہ متذہ بے الہذا اسے الانوار بھی کہہ دیتے ہیں۔“

حسین: بے شک صحیح ہے۔ اب میراطمینان ہو گیا۔ اور انشاء اللہ بھی اپنے انعام پر نہ پچھتا ہو گا۔ لیکن امیدوار ہوں کہ اب مجھے وہ سرو شہستان دکھایا جائے جہاں میری زمرہ اجرام فلکی کے پہلو میں بیٹھی جلوہ افغانی کر رہی ہے۔

شیخ: بہتر۔

یہ کہہ کر شیخ نے اٹھ کے اپنی کتابوں کا صندوق کھوا۔ اُس میں سے ایک چھوٹی کتاب نکالی۔ پھر اس کے ورق اٹھے، ایک خط نکالا اور اُس کو حسین کے ہاتھ میں دے کے کہا۔ اس خط کو احتیاط سے رکھا اور اسی وقت روانہ ہو کے شہر اصفہان کی راہ لے۔ یاد رکھ کہ اصفہان کے شمالی پچھاٹک کے باہر ایک شکستہ اور قریب لا نہدام مسجد ہے۔ اُس میں تو ایک فقیر کو پاؤے گا جو بظاہر بھیک مانگتا ہے مگر باطن میں ایک بڑا خدا شناس شخص ہے۔ یہ فقیر ہر وقت اپنے جسم پر ڈنبے کی کھال اڑھے رکھتا

بے اور انکسارا یہ صدالگا کر راہ گیر دیں سے مانگتا ہے کہ ”دہنِ سگ بے قمہ دوختہ ہے“۔ کاظم جنوہی اس کا نام ہے۔ یہ خط لے جا کے اس کے ہاتھ میں دے اور میرا سلام کہہ۔ رات کو تجھے وہ ایک غار میں لے جائے گا جہاں تو ایک بڑے امام واقف اسراء سرمدی سے ملے گا۔ اسی وقت تو جنت کے مدارج طے کرنا شروع کر دے گا اور چند ہی روز کی زندگی میں جو زیادہ تر خواب کی تی ہو گی، فردوس میں کے اعلیٰ منازل میں جا پہنچے گا۔

حسین نے خط لے کے شیخ کے ہاتھ کو بوس دیا۔ پھر رخصت ہونے کے طریقے سے ان کے قدم چوٹے اور اصفہان کی طرف رخ کر کے لکھرا ہوا۔ اب اس کا یہ سفر زیادہ اطمینان سے تھا۔ گناہ کی ملامت و ندامت کے اثر کو شیخ علی وجودی کی تقریر نے اس کے دل سے بالکل محور کر دیا تھا۔ امید اور آرزو کا باعث اس کی آنکھوں کے سامنے تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمردا آ کے ہم کنار ہوا چاہتی ہے۔ اسی اطمینان اور ان ہی مسرتوں کے ساتھ بغداد ہوتا ہوا اصفہان پہنچا۔ شمالی پھانک کے باہر مسجد کے دروازے پر متعدد لکھڑا تھا کہ کان میں آواز آئی ”دہنِ سگ بے قمہ دوختہ ہے“، فوراً دوڑ کے مسجد میں گیا اور شیخ کا خط نکال کر کاظم جنوہی کے ہاتھ میں دے دیا جو دنبے کی لحاظ اور ڈھنے بیٹھا زور سے صدائیں لگا رہا تھا۔

کاظم جنوہی نے حسین کو حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھا اور جوش و حشت کے لبھے میں چلا اٹھا۔ ”خدر از اہل علم خذر“، مگر جب خط کو پڑھا تو فوراً اٹھ کے بغل گیر ہوا اور کہا ”میں نہیں سمجھا تھا کہ شجر معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔ آؤ، بیٹھو۔ کھاپی کے آرام کرو۔ رات ہو تو تم کو شیخ الحب کے پاس لے چلو۔“ حسین حیانہ الحب اختیار کرنی چاہیے۔ دن چونکہ مظہر النور بے لہذا دن بھر وہ اپنے اوپر انوارا ہوتا۔ اکبر کا انعام کرتے ہیں۔ اور رات چونکہ تیرہ دو تار اور شمعونہ ظلمت بے لہذا اسی

ظلمت میں وہ مادی پیکروں سے ایک گونہ علاقہ پیدا کرتے ہیں۔

حسین: مگر معلوم نہیں مجھے جیسے گناہ گاریزویہ کار سے وہ مانا بھی پسند کریں گے؟  
کاظم جنوبی: ضرور ملیں گے۔ شجر معرفت کی ایک شاخ تم ہو۔

حسین دن بھر اسی مسجد میں رہا اور شام کے بعد ایک ٹھنڈی رات گزر گئی تو کاظم جنوبی اسے ساتھ لے کے یہ دن کو ہستان کی طرف روانہ ہوا۔ بہت سے نشیب و فراز طے کر کے اور کئی لھائیوں سے گزر کر کاظم ایک بڑے غار کے دہانے پر پھر گیا اور زور سے چلا یا:

”یا شیخ! ظلمت مادی میں ایک جگنو چپکا ہے۔“ مگر کچھ جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کے کہا۔ ”ایک آئینے سے پرداہ اٹھا، جو تجلیات انوارِ الہوتی سے منعکس ہونا چاہیے۔ اب بھی کوئی جواب نہ ملا۔ پھر کاظم جنوبی نے پکار کر کہا ”ایک آئینے پیکر کا مقید سر و شہستان جانے کے لیے مصروف ہے۔“ اس تیسری ندادرت پر غار کے اندر سے چنانوں سے گوختت ہوئی اور انہیں ہرے میں سستناتی ہوئی آواز آئی۔ ”مر جبا! جوان آفی مر جبا! جنت کی ایک حور دوسال سے تیرے فراق میں بے تاب ہے۔“ میں نے اپنی سیرِ الہوتی میں ایک طرف اس حور کو فردوس بریں کے گوشوں میں روئے اور دوسری طرف تجھے راہ طلب میں قدم مارتے دیکھا ہے۔ اب میں سے تجھے لذ ایند سر و شہستانی حاصل ہونے لگیں گے۔ قدرت کے کرشمے دیکھو۔“ اس جملے کے ساتھ ہی غار کی تھی میں ایک روشنی نمودار ہوئی اور کاظم جنوبی نے حسین سے کہا:

”بس آگے میں نہیں چل سکتا۔ مجال نہیں کہ ایک قدم بھی آگے جاؤں۔“

حسین: کیوں؟

کاظم جنوبی: اگر کیک سر ہوئے بر ترپرم

فروغ تجلی بسوہ دپرم

جاوہ اور یقین جانو تم شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہو۔

یہ سنتے ہی حسین نے کاظم جنوہی کو اوپر چھوڑا، خود جوش دل کی بے خودی میں امید و آرزو کے خواب دیکھتا ہوا غار میں اترنا تھوڑی دیر تک تو ادھر ادھر کی چٹانوں سے لکریں کھاتا رہا مگر آخر کار انہا تک پہنچ گیا جہاں اُسے وہنی طرف ایک زینہ ملا۔ اس زینے کے ذریعے سے اور زیادہ نیچے گیا تو اپنے وہم و گمان کے خلاف اس خوفناک کوہستان اور درندوں کے مسلک کے نیچے ایک نہایت وسیع، عالی اور بہت بارونق مکان نظر آیا جس میں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں اور عودوں باں سلگ رہا تھا۔ درود یوار پر طائی رنگ کے نقش و نگار بنائے گئے تھے اور ان بیل بوٹوں میں نگین پتھر اور شیشے کے لکڑے جڑے ہوئے تھے جن پر شمعوں کا عکس پڑ کے ہر سمت ایک عجیب عالم پیدا کرتا تھا۔ حسین اس تمام سامانِ عیش کو دیکھ کر مبہوت خود رفتہ ہو گیا اور بے صبری کے جوش میں چلا اٹھا کیا فردوسی بریں بھی ہے؟، کہیں قریب ہی تسلی آمیز لجھے میں آواز آئی، مگر سرو شہستان کے بس کرنے کے لیے یہ پہلی منزل ہے، جہاں پتھر کے وہ اس قابل بنائے جاتے ہیں کہ جنت کی مسروتوں کو یک دیکھ کے از خود رفتہ نہ ہو جائیں۔“

”حسین: مگر آپ کون ہیں، اور کہاں ہیں کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہو کے شکر گزار ہوں؟“  
”میں تیرے قریب ہی ہوں،“ ناگہاں ایک آواز آئی۔ منقش پرده جو پہلے دیوار کا دھوکا دے رہا تھا، کھنچ کے نظر سے غائب ہو گیا اور ایک معمراً قوی الجسم نہایت ہی نورانی صورت کا آدمی نظر آیا جو زر تار مند پر گاؤ تکیے سے لگا ہوا عجیب بے پرواہی اور بے نیازی کی شان سے بیٹھا تھا۔ اس کا نورانی چہرہ آئینہ کی طرح صاف تھا اور اس وقت چاروں طرف سے شمعوں و نیز درود یوار کے

شیشوں کی خوبصورتی سے آفتاب کی مثل چمک رہا تھا۔ سفید لمبی ڈاڑھی آفتاب کی کرنوں کی طرح چمک رہی تھی۔

حسین یہ نورانی صورت دیکھتے ہی پروانے کی طرح دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور کہا ”فرمایئے، آپ کون ہیں؟ شاید رضوان آپ ہی کا نام ہے؟“

پیر مرد: نہیں۔ ابھی تو اسی تیرہ خاک داں، عنصری کی حدود میں ہے۔ مگر باں، تیری آنکھوں پر سے پہلا پردہ اٹھا ہے۔ اہل دنیا مجھے شیخ الحج (غار والا شیخ) کہتے ہیں مگر اہل حقیقت کی اصطلاح میں طور معنی کہلاتا ہوں۔

حسین: (حیرت سے) طور معنی حقیقت میں وہی نور ہو گا جو موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر نظر آیا تھا۔

طور معنی: مگر ٹوٹے ستر ہزار حجاجوں کے اندر سے دیکھ رہا ہے۔

حسین: اللہ وہ سب پر دے بھی اٹھا دیجیے۔

طور معنی: ابھی ان ماڈی کثیف آنکھوں میں اس کی قابلیت نہیں۔ مگر صبر کر۔ اسی کا سامان ہو رہا ہے۔ یہ سب پر دے اٹھ جائیں گے۔

یک ایک خوبصورت نو عمر لڑکے نے آکے ایک ثربت کالبر یز جام طور معنی کے ہاتھ میں دے دیا اور طور معنی نے اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھا کے کہا ”اس جام کو پی اور ملکوت سے ایک درجہ اور قریب ہو جا۔“ حسین نے وہ جام فوراً پی لیا جس کے ساتھ ہی اس کا دماغ چکر کھانے لگا اور طور معنی کے ساتھ لپٹ کے غافل ہو گیا۔ اس غفلت اور خودوار فتنگی کی نیند میں کئی دفعہ اس کی آنکھ گھلی اور ہر مرتبہ اپنے آپ کو نئے مقام میں پاتا تھا۔ کسی سر بزرو شاداب میدانوں میں ہوتا اور کبھی

وحشت ناک اور پُر خطر گھائیوں میں۔ ہر بیداری میں فرشتہ یا انسان، مگر غیر معمولی قسم کے اوگ، اسے سرو شہستان کے اور زیادہ قریب ہونے کا یقین دلاتے اور وہ یقین کر لیتا۔ آخر ایک مرتبہ اس کی آنکھ گھلی تو ایک نئے نوجوان شخص کے پاس تھا۔ یہ شخص حریر سفید کے کپڑے پہنے تھا جس پر شہرا کام تھا۔ اس کے سر پر نہایت ہی بیش قیمت تان تھا اور اس میں اعلیٰ درجے کے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ حسین کی آنکھ جیسے ہی اس خوبصورت نوجوان کے سامنے کھلی جو شابانہ لباس پہنے اور مُرّضع تان سر پر رکھے ہوئے تھا، وہ نہایت ہی التجاو عاجزی کے لمحے میں کہنے لگا ”آمیدوار کو انتظار نے بے صبر کر دیا ہے۔“

شخص: اے جسمِ خاکی! تو مرا حل تحریر کو طے کر چکا تھے نہیں خبر کہ تو آسمان کے قریب اور فردوس میں کے دروازے پر ہے۔ اب نہ گھبرا۔ ملائکہ مُقرّبین تیرے انتظار میں ہیں اور حوریں تیرے لیے بناؤ سنجھا رکر رہی ہیں۔

حسین: اور آپ کون ہیں؟

شخص: میں وہ برزخ ہوں جو لا ہوت و نا ہوت میں داسطہ ہے۔ یہی میرا جسم پے جو کبھی ٹور بن کے سینے پر چمکا تھا۔ یہی وہ نور ہے جو مسیح علیہ السلام کے جسم سے خدا کی شان دکھاتا تھا اور مردوں میں زندگی کا چدائی روشن کر دیتا تھا۔ یہی وہ نور ہے جو اشراق مجرد کی شان سے رسول آخر ان زمان ﷺ کے سینے میں چمکا۔ اور یہی وہ نور ہے جو امامت کے مشعل روشن کر کے معصوم جسد و مکعب کو بدلتا ہے۔

حسین: تو آپ جبرئیل ہیں؟

شخص: جبرئیل میرے تنوعات کی ایک چھوٹی سی شمع ہے۔

حسین: شاید آپ وہی لایمودت ہیں؟

شخص: وہی لایمودت نہیں، تھی لایمودت، مگر اس تشخیص کے ساتھ دعویٰ نہیں کر سکتا۔ گویا ضرور کہوں گا آنا خالق الارواح، آنا خالق الاصحاب۔ لیکن اس وقت تو ایک پیکر متغیر میں ہوں اور وہ امام بن کر نعمودار ہوا ہوں جس پر ایمان لانا ہر مکاف کا فرض ہے۔

حسین: (باتھ سے ہاتھ ملا کے) تو میں بھی آپ کی امامت کے لیے اس مظہر نقطے وحدت کے ہاتھ پر بیعت کروں؟

شخص: حسین، سُن تو منزلِ مقصود کو پہنچ گیا، مدارجِ صعود طے ہو گئے اور عنقریب تو اس پر شوق آنکھوں میں ہو گا جو دوسال سے تیرے لیے گھلی ہے۔ اگر چاہ کوئی عبادت دنیاوی تجھ پر فرض نہیں تا ہم ارضی کشافت کا باقی ماندہ اثر دل سے نکال ڈالنے کے لیے ضرور ہے کہ اس سر و شہستان کے پھاٹک پر تین دن تک بیٹھ کے تو ایک مختصر سی عبادت کرے۔ تین شبانہ روز تیری زبان سے نکلتا رہے کہ مر گو اتو راغر قلنی فی بحر انوارِ ک۔ مگر شرط یہ ہے کہ چاہے کچھ کھائے مگر ان تین دن میں پانی کا کوئی قطرہ تیرے حق سے نہ آترے۔

اتنا کہہ کر یہ تا جدار شخص تین روٹیاں چھوڑ کے چاگیا اور اس کے جاتے ہی مکان کے سب دروازے یکا کیک اور ایک ساتھ بند ہو گئے۔ پہلے تو یہ اپنی تہائی کی حالت دیکھ کر گھبرا یا مگر فوراً اس آخری مرشد و امام کی نصیحت یاد آئی اور ریاضت اور وظیفہ میں مشغول ہو گیا۔ علی ال تعالیٰ ایک ہی جملہ کہتے رہنے اور پھر پانی نہ پینے کا یہ نتیجہ تھا کہ تیرے روز پیاس نے مجتوں بنادیا تھا۔ ہونٹوں سے لے کے سینے تک سارا گلا خشک تھا اور سوائے سائیں سائیں کے اور کوئی آواز نہ نکلتی تھی۔ مگر زمرد کے شوق میں وظیفے سے زبان بند نہ ہوئی اور اسی استقلال اور خود فراموشی سے دعا پڑھتا جاتا

تیرے روز حسین زبانِ حال سے اعطش پکار رہا تھا کہ وہ تاجدار نوجوان شاہانہ لباس پہنے ہوئے آیا اور کہا ”لے اب سفر جنت کے لیے تیار ہو۔ تیری ریاضت پوری ہوئی۔ تو نے سب مرا حل یقینی طے کر لیے اور کوئی چیز باقی نہ رہی جو اس راہ میں تیری مزاحم ہو۔ مگر تو پیاسا ہے۔ زرا اپنے آپ کوتازہ دم کر لے۔“

اس شخص کی زبان سے یہ جملہ پوری طرح نکل نہ پایا تھا کہ ایک حسین و ناز نہیں عورت ایک سونے کا مرصع جام باتھھے میں لیے، جو ایک خاص قسم کے لطیف و خوش رنگ شربت سے لبا لب تھا، حاضر ہوئی۔ اس شخص نے جام کو حسینہ کے باتھھے سے لے کے حسین کی طرف بڑھایا اور کہا:

”لے، یہ شراب طہور ہے جس کے دوار فردوسِ بریں میں ہمیشہ چلتے رہتے ہیں۔ اس کے پینے سے تیری پیاس، ماندگی، تھکن اور جملہ بد مزگیاں جاتی رہیں گی اور تو ایک نہایت ہی نورانی اور رُوحانی شرود کے ساتھ جنت میں داخل ہو گا۔“

حسین نے فوراً جام لے کے منہ سے اگالیا، اور پیاس کی ایسی شدت تھی کہ وہ دو ہی گھونٹ میں اُتار گیا۔ ایک لمحہ گزر رہا ہو گا کہ اُسے سر میں گرانی سی محسوس ہونے لگی جس کے ساتھ ہی خمار آ لو د آنکھیں جھپک جھپک کے بند ہو گئیں۔ وہ بے ہوش تھا، اور بے ہوشی بھی ایسی کہ سروپا کی خبر نہ تھی۔

## فردوسِ بریں

حسین کو خبر نہیں کہ یہ غفلت کتنی دیر تک اس پر طاری رہی۔ لیکن مد ہوشی تھوڑی کم ہوئی تھی اور نشہ اُترنا شروع ہوا تھا کہ ایک نہایت ہی دل کش اور وجہ آور نغمے کی آواز کان میں آئی اور ایسا معلوم ہوا کہ گویا دل فریب و دل ربا پری پیکر دل کا ایک طائفہ عجیب و غریب اور انہٹا سے زیادہ پر لطف با جوں اور مزمیر کے ساتھ اپنے نور کے گلوں سے دلوں خیز بہار کی مسّرت انگیز دھن میں یہ ترانہ مبارکباد گا رہا ہے کہ ”سلام علیکم طبقتم فادخلو! با خالدین۔“ ایک جوش مسّرت کی بے اختیاری سے اُس نے گھبرا کے آنکھیں کھول دیں۔ ہر طرف ایسا سماں نظر آیا کہ جد ہر نظر جاتی ہے:

کرشمہ دامنِ دل می گشہ کہ جا ایں جاست

حسین نے اُس وقت اپنے آپ کو اس حالت میں پایا کہ ایک طلا کار اور مرصع کشتی میں سوار ہے اور نازک بدن اور پری جمال لڑکوں کی کوشش سے وہ کشتی ایک پتلی مگر بہت ہی دلکش نہر کے کنارے ابھی ابھی آ کے ٹھہری ہے۔ نرم اور نظر فریب سبزے کو شفاف اور پاک و صاف پانی اپنی روائی میں چومتا ہوا نکل جاتا ہے۔ بعض مقامات پر گنجان اور سایہ دار درخت ہیں جو پیچیدہ اور خدار زلفوں کی طرح نہر کی گوری مگر نہ آسود پیشانی پر دونوں طرف جھکے پڑتے ہیں۔ مگر جہاں پر کشتی کنارے لگی ہے، وہاں ایک کشاور مرغزار ہے۔ ان خوبصورت ملائحوں کے کہنے کے بموجب وہ کشتی سے اُتر کے سبزہ رو سیدہ کی سیر کرنے لگا۔ وہاں جا کر دیکھا تو اور حیرت ہوئی۔ پانی کے پاس ہی سبزے کا ایک پتلہ اور برادر حاشیہ چھوڑ کے شگفتہ اور خوش رنگ پھولوں کا سلسہ شروع ہو گیا۔ جونہر کے دونوں طرف تھدِ نظر تک پھیلتا چاگیا ہے۔ اگرچہ پھولوں میں شادابی و خوش رنگی کی وہی شان ہے جو خود رو

پھولوں میں نظر آتی ہے مگر اس قدر تی اجتہاد کے ساتھ خوش رنگی، لیاقت بلکہ بظاہر فوق العادت ہو  
شیاری و دانائی سے چمن بندی کی گئی ہے۔ چمنوں کی بعض قطاریں تو ایسی ہیں جن میں ایک ہی قسم  
کے اور ایک ہی رنگ کے پھول ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک ہی قوم اور ایک ہی وردی کی فونج  
مختلف کیمپوں پر تقسیم ہوتی چلی گئی ہے۔ مگر اکثر چمن ہیں جن میں مختلف رنگ کے پھولوں کو ترکیب  
دے کر زمین پر ایسی گل کاریاں کی گئی ہیں کہ عقل انسانی حیرت میں آ جاتی ہے۔ سارا مرغزار اور  
ساری وادی جو کوسوں دور تک پھیلی ہوتی ہے اور جیسے ہو ابصورت متوازی اور سر سبز و شاداب  
پہاڑوں نے اپنے حلقے میں لے لیا ہے، ان چمنوں اور پھولوں سے بھری ہے اور مختلف نہریں جو  
پانی کی چادریں بن بن کے پہاڑوں سے اترتی ہیں، ان ہی چمنوں اور پھولوں کو درمیان جا بجا بہہ  
رہی ہیں اور ان کے پانی نے خواہ پھولوں کی خوشبو سے مٹاٹھا ہو کے کسی اور وجہ سے گلاب اور  
کیوڑے کی شان پیدا کر لی ہے۔

یہ نہریں زبان حال سے پکار پکار کے کہہ رہی ہیں کہ ہم ہی تنہیں و سلبیل ہیں۔ راستوں اور روشنوں  
کی ترتیب میں مجزہ نہما کیفیت پیدا ہو گئی ہے کہ ہر چمن کے ایک پہلو کو نہر ڈھوتی ہے تو اس کے  
دوسرے پہلو کو ایک چھوٹی سی خوشنما سڑک اپنی آنکھوں میں لیتی ہے۔ یہ سڑک چمن سے بھی زیادہ  
کمال صفائی دکھار رہی ہے۔ مختلف قسم اور مختلف رنگ کے سنگ ریزے بچھا کے کوئی سڑک فیروزے  
کی کوئی یاقوت کی اور کوئی نیام کی بنادی گئی ہے۔ پھر ترتیب میں یہ لطف ہے کہ جس رنگ کے  
پھولوں کا چمن ہے، اسی کی مناسب و موزوں رنگ کی نیلی خوش نما سڑک اس کے پہلو سے گزری  
ہے۔ نغمہ سنج طیوران چمنوں میں اڑتے پھرتے ہیں، پھولوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کے عشق و محبت کی  
داستان سناتے ہیں اور خدا جانے کس کمالِ استادی سے تعلیم دی گئی ہے کہ اکثر جانے والے جہاں

دیگر اطراف میں پری پیکروں کے نورانی گلوں سے خیر مقدم کا ترانہ سُنھتے ہیں، وہاں ان غمہ سُخ طاڑوں کا ساز بھی اپنے قدرتی ارغنوں سے یہی کلمہ خیر مقدم سناتا ہے کہ ”سلام علیکم طبیعت فاؤ گلو ابا خالدِ یعنی۔“

حسین نے نہایت حیرت و جوش سے دیکھا کہ ان چمنوں میں جا بجا نہروں کے کنارے سونے چاندی کے تخت بچھے ہیں جن پر ریشمی پھولدار کپڑوں کا فرش ہے۔ لوگ پُر تکلف گاؤں تکیوں سے پیٹھوں لگائے دلفریب اور ہوش ربا کم من اڑکوں کو پہلو میں لیے بیٹھے ہیں اور جنت کی بے فکریوں سے لطف اٹھا رہے ہیں۔ خوبصورت آفٹ روز گارڈر کے کہیں تو سامنے دست بستہ کھڑے ہیں اور کہیں نہایت بھی مزاكہت اور دلفریب حرکتوں سے ساقی گری کرتے ہیں۔ شراب کے دور چل رہے ہیں اور گزر کے لیے سددھائے یا قدرت کے سکھائے ہوئے طیور پھولدار درختوں سے پھل توڑ توڑ کے لاتے ہیں اور ان کے سامنے رکھ کے اڑ جاتے ہیں۔ پھل ہی نہیں، یہ خوشنما طیور کپڑوں میں لپٹے ہوئے کبابوں کی پٹلیاں بھی لاتے ہیں اور ان کے لیے میکشی اور شاہد پرستی کا پورا سامان فراہم کر دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ حسین چیز جس نے حسین کو متوجہ کیا وہ یہ تھی کہ سب لوگ بے غل و غش نہایت بے فکری اور اطمینان سے ان لذتوں کے مزے اوت رہے تھے اور خبر بھی نہ ہوتی تھی کہ پاس سے کون گذرتا ہے اور انہیں کس نظر سے دیکھتا ہے۔ نہ کسی کو کسی سے حسد تھا اور نہ کسی کو کسی لطف کے چھپانے کی ضرورت تھی:

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

کے رابا کے کارے نباشد

یہ عالم دیکھ کے حسین کے دل میں ایک جوش و لولہ پیدا ہوا۔ اس نے کسی قدر بلند آواز سے کہا۔

بے شک فردوسِ بریں یہی ہے! یہیں آ کے نیکوکاروں اور ایمان داروں کو اپنے اعمالِ نیک کا صد  
ملتا ہے۔ مگر افسوس! اے زمرد! تو کہاں؟، یہ جملہ نا تمام ہی تھا کہ پاس کے چمن کے پھولوں کے  
نیچے سے ایک شیریں ودل کش آواز سے کسی نے کہا، تو بھی جنت کے چمنوں ہی کو دیکھ رہا ہے۔  
ذرالحلوں اور قصروں کو بھی نظر انھا کے دیکھے۔

اس نے یہ آواز سنی ہی تھی کہ سامنے سے ایک نہایت ہی نازک اندام اور قیامتِ خیز نازمین نے  
گلے میں باہیں ڈال دیں اور مسکرا کے کہا ”میں بھی تیرے لیے ہوں۔“ حسین ذرا جھک کر اس سے  
علیحدہ ہوا غور سے اس کی صورت دیکھ کر کہا، ”مگر میں پیاری زمرد کے سوا کسی کو نہیں چاہتا۔“  
نازمین: وہ بھی مل جائے گی۔ آپ کی خوشی کا پیانہ تنگ ہے۔ ذرا ان سروری مسروتوں سے نگاہ اور  
دل آشنا ہو لیں تو ان سے ملیے گا۔ دیکھیے جو سامنے موئی کا قصر ہے، وہ آپ ہی کے لیے ہے اور  
زمرد اسی میں ہے۔“

حسین نے نظر انھا کے اس رفع الشان قصر کو دیکھا اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر دیگر عمارتوں پر  
بھی جا پڑی۔ اُسے نظر آیا کہ یہ عمارتیں باغوں سے بھی زیادہ مسٹر انگلیز ہیں۔ بعض بالکل سونے  
کی، بعض موغلی کی اور بعض موتویوں کی نظر آتی ہیں۔ تمام مکانات جو حسبِ حیثیتِ محل، قصر اور  
کوشک کے لفظ سے تعبیر کیے جاسکتے ہیں، مذکورہ اشیاء کے علاوہ ان ہی میں کوئی فیروزے کا کوئی  
زمرد کا کوئی یاقوت کا اور کوئی ہیرے کا ہے۔ موئی کے محل جن میں سے ایک حسین کے لیے ہے،  
ایسے آب دار رنگ میں رنگے ہوئے ہیں کہ نیچے سے اوپر تک ایک ہی موئی میں ترشے ہوئے  
معلوم ہوتے ہیں۔ ان میں جا بجا صدق صادق کے جملکتے ہوئے ٹکڑے جڑے ہیں۔ تمام محلوں پر  
علاوہ اس رنگ کے جس طرف وہ محل منسوب ہیں۔ ہر درود یا وار کے گرد بلور اور شیشے کے ٹکڑوں

کا حاشیہ بنا ہوا ہے اور ان شیشوں کے نیچے ڈاک دی ہوئی ہے۔ یہ آئینے دن کو آفتاب کی اور رات کو ہزار ہا کافوری شمعوں کی روشنی میں اس قد رجگھا اٹھتے ہیں کہ تیز سے تیز نگاہ پہنچانے لگتے ہے۔ اس کے علاوہ ان دیواروں میں اندر باہر جواہرات جڑے ہیں جو اپنی کرنیں چمکا چمکا کے ایک عجیب اٹھ ف پیدا کرتے ہیں۔ بہر تقدیر اس مجموعی سامان، شہری روپیلے اور رنگ برنگ کے قصر و ان کے آئینوں اور جواہرات نے ہر چہار طرف ایک ایسی کیفیت بنا رکھی ہے کہ نظر پڑتے ہی انسان کے دل میں ایک جوش اور راولہ پیدا ہو جاتا ہے۔

حسین ان محلوں کو دیکھ کر ذرا مبہوت لکھ رہا مگر ہوش کے آتے ہی اس خاص محل کی طرف متوجہ ہو اجس کی نسبت اس پری پیکر کی زبان سے سنا تھا کہ خاص اس کے لیے ہے اور جس میں پیاری زمرد کے ملنے کی امید تھی۔ اس نے کسی چیز کی طرف نظر اٹھائی تھی کسی سامانِ عشرت کو دیکھا اور سیدھا اس قصر کے دروازے پر جا پہنچا۔ زمرد استقبال کے لیے محل سے باہر نکل آئی تھی۔ وہ ایک غیر معمولی مگر نہایت دلرباوضع سے بال کھولے اور زلغوں کو شانوں اور پیٹھ پر بکھیرے لکھری تھی۔ آنکھیں دو چار ہوئی تھیں کہ بے اختیاری کے جوش میں دونوں کی زبانوں سے ایک دوسرے کا نام لکھا اور وہ دوڑ کے لپٹ گئے۔ حسین تو حسرت میں تھا ہی، زمرد کے چہرے سے بھی ایک غیر معمولی مسخرت و جوش دیکھ کر بے اختیار ہو کے رونے لگا۔ اس کی سانس سے رونے کا پتا پا کے زمرد نے اپنے آپ کو علیحدہ کیا اور کہا:

”حسین! یہاں رونا حرام ہے۔ پس آنسو پوچھ ڈالو۔“

حسین: (آنسوں کو پوچھ کے) زمرد، یہی فردوسِ بریں ہے؟“

زمرد: یہی۔

حسین: تم یہاں چلی آئیں اور مجھے اس درد والم میں چھوڑ دیا۔

زمرد: یہ تو میرے اختیار کی بات نہ تھی۔ مجھے تو ایک اتفاقی شہادت نے یہاں پہنچایا ہے۔ مگر تمہاری زندگی باقی تھی، اور ضرور تھا کہ اتنے مدارج و مراحل طے کر کے یہاں آؤ۔ مگر اس جنت میں بھی تم کبھی چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ کیا کہوں، کس قدر دشواریوں سے مجھے اتنی اجازت ملی ہے کہ تمہیں اپنے پاس آنے کا راستہ اور طریقہ بتاؤں۔

حسین: میرے تو ایسے اعمال تھے کہ شاید مرنے کے بعد بھی یہاں نہ پہنچ سکتا۔ صرف تمہاری محبت تھی جو نظرِ طریقت بن کے لائی۔

زمرد: میری محبت؟

حسین: ہاں، تمہاری محبت۔

زمرد: لیکن اگر تمہارے دل میں طلب صادق نہ ہوتی تو میں کیا کر سکتی تھی؟

حسین: مگر اس طلب سے تھوڑا ہی ممکن تھا کہ اس ملائے اعلیٰ میں آپنچتا۔ میں تو دل میں ٹھان چکا تھا کہ اس قبر کے پاس اور اس چٹان کے سامنے جس پر تمہارا نام کندھے، پڑے پڑے دم توڑ دوں گا۔

زمرد: خیر، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی اب اندر چل کے آرام سے بیٹھو۔ شراب طہور کے دو جام پیو اور دیکھو اس خداوند جلشِ علیٰ نے تمہارے لیے کیسے کیسے سماںِ راحت اور کیسی کیسی لذتیں فرم کر رکھی ہیں۔ (یہ کہہ کر زمرد حسین کو اندر لے گئی۔) جس وقت حسین نہر کے کنارے کشتو سے اتراء ہے، ہر شام کا وقت تھا۔ مگر اب رات ہو گئی تھی۔ ہر طرف کافوری شمعیں روشن ہوئیں۔ ایک خاص قسم کی لٹھنڈی روشنی جس کا پتانہ چلتا تھا کہ کہاں سے آتی ہے اور کیونکہ پیدا ہوتی ہے دروازوں اور

بند کھڑکیوں اور چھپت کے روشنہ انوں سے رہ رہ کے چمک اٹھتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا یکا کیک  
ہزار مہتابیاں چھوڑ دی گئیں۔ اس تیز روشنی میں شمعیں ماند پڑ جاتی تھیں اور سارے ہم صحبوں کا  
چہرہ ایک دوسرے کو پیارا اور دفتریب نظر آنے لگتا تھا۔ اس غیبی روشنی کو حسین نے حیرت سے دیکھا  
اور دریافت کیا کہ یہ کیسی روشنی ہے؟ وہ بار بار دروازے سے باہر جھانک کے دیکھا مگر کچھ حال نہ  
گھلا۔ صرف اتنا معلوم ہوا کہ اس روشنی کا مرکز منع اور گرد کی پیماڑیوں کی چوٹی پر ہے جہاں وہ  
زیادہ چمکتی ہے اور وہیں سے اس کی کرنیں آکے تمام مکانات کو روشن کر دیتی ہیں۔ ایک یہ بات  
اس نے دیکھی کہ جب روشنی پوری اور کمال پڑ آ جاتی تو چاروں طرف سے لوگ چلاؤ اٹھتے ہیں۔<sup>۱</sup>  
ہند الہدی و عَدْنی رَبِّی۔ سب کے ساتھ ایک بے اختیاری کے جوش میں یہی کلمہ خود حسین کی زبان  
سے بھی کئی مرتبہ نکل گیا۔ جب اس روشنی کا راز حسین کے لیے حل نہ ہو سکا تو اس نے زمرد سے  
پوچھا ”یہ کیسی روشنی ہے؟“

زمرد: تم نے نہیں پہچانا؟ یہی وہ نورِ الٰہی ہے جو موی کو وادیِ ایمن میں نظر آیا تھا۔ تم نے قرآن و  
حدیث میں پڑھا ہے کہ جنت میں خدا کا دیدار ہو گا۔ اس سے یہی نور عبارت ہے۔  
حسین: تو یہی خداوند جبل و علی ہے؟

زمرد: یہ تو نہیں کہہ سکتی مگر ہاں۔ اس کے تنویں اولی کی سب سے زیادہ مکمل اور پچھی تصویر یہی  
ہے۔ یہ جواب سن کر حسین اس نور کے سامنے سجدے میں گر پڑا مگر زمرد نے اٹھایا اور کہا ”یہاں  
عبادت کی تکلیف نہیں۔ یہ نور صرف اس غرض سے ہے کہ لوگوں کے دل میں اطمینان کی مشرت  
پیدا ہو۔“

اب حسین نے مکان کے فرش اور تمام سامان کو دیکھا، اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ سب نوری سامان

بے جو دنیا میں نہ کبھی انسان کے دل میں گزر آپے نہ کسی کے قیاس و گمان میں آ سکتا ہے۔ زمرداری کے ہاتھ میں ہاتھ دیے یہاں کی عجوبہ چیزیں دکھاتی پھرتی تھی اور حسین ہر چیز پر خدا نے ذوالجلال والا کرام کی قدرت و رحمت کا جوش و خروش سے اعتراف کرتا تھا۔ آخر پھرتے پھرتے ایک مقام پر رک گیا اور نہایت گرم جوشی کے ساتھ زمرد سے لپٹ گیا اور کہا ”یہ سب لطف اور سارے سامان عیش کے ہیں۔ مگر زمرد امیرے لیے کوئی تجھ سے بڑی نعمت نہیں ہو سکتی۔“

زمرد: یہی محبت تمھیں یہاں لائی ہے، ورنہ یہ وہ مقام ہے جہاں کسی زندہ انسان کا بہت کم گزر ہوتا ہے۔ یہ تمھاری بڑی فضیلت ہے کہ اس جسم خاکی کے ساتھ اس نورستان میں آپنچے۔ حسین کو جنت میں پھرتے اور زمرد کے حسن و جمال سے لطف انٹھاتے پورا ایک ہفتہ گزر گیا ہو گا۔ اور یہ ہفتہ اس حالت میں گزر اک دل کش اور نشاط انگیز نغموں کی آواز پر اثر کانوں میں گونجتی رہتی تھی۔ بہت سی سوریں اس کی خدمت کو حاضر تھیں اور سب پر یہ جمال و زاہد فریب تھیں۔ مگر اسے زمرد کے سوا کسی سے کچھ علاقہ نہ تھا۔ ہر وقت زمرد کی بغل میں ہاتھ رہتا اور دونوں ہمیشہ فرحت بخش وادیوں اور روح افزام غزاروں میں ٹھیک رہتے۔ زمرد نے اتنے زمانے میں پھر پھر کے اسے یہاں کی تمام نیزہت گاہیں اور سب بجا بات دکھادیے۔ ایک مرتبہ حسین نے کہا ”زمرد اسی میں سنتا تھا کہ جنت میں ہمیشہ صحیح کا وقت ہوتا ہے مگر آ کے دیکھاتو یہاں بھی دنیا ہی کے سے تغیرات موجود ہیں۔“

زمرد: اس امر میں لوگوں کو سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے یہ کہا جاتا ہے کہ یہاں ہر وقت صحیح ہی رہتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور کسی وقت کا لطف انسان یہاں انٹھا سکتا ہی نہیں۔ ایسا ہو تو جنت سے ایک بڑا لطف انٹھ جائے۔ اصل مطلب یہ ہے کہ یہاں ہر وقت کوئی ایسا مقام ضرور مل جائے گا جہاں

انسان جس وقت کا چاہے، لطف اٹھائے۔

حسین: کیونکر؟

زمرد: زبان سے کہنے کی نہیں۔ میں چال کے تمہیں آنکھوں سے دکھائے دیتی ہوں۔

یہ کہہ کے زمرد اسے لیے ہوئے محل سے باہر نکلی اور کہا ”دیکھو! یہاں دو پھر کا سماں ہے۔ اب آگے چلو۔“ تھوڑی دیر بعد دونوں ایک ایسے درختوں سے گھرے ہوئے سبزہ زار میں پہنچ جہاں آفتاب کی روشنی کو درخت روکے ہوئے تھے، ہر طرف اندر ہیرا چھایا ہوا تھا اور مشرقی قلعہ ہائے کوہ سے بلکی روشنی نمودار تھی۔ زمرد یہاں پہنچ کے بولی ”دیکھو: یہ صبح کا وقت ہے۔“

حسین: بے شک، ہے۔

زمرد: آگے چلو۔

یہاں سے روانہ ہو کے تھوڑی دیر میں دونوں ایک ایسی چھوٹی سی وادی میں پہنچے جو ہر طرف سے پہاڑوں میں گھری ہوئی تھی۔ یہاں بھی درختوں نے خفیف تاریکی پیدا کر دی تھی اور ذرا فاصلے کے مقامات پر ہلاکا ڈھواں اٹھتا نظر آتا تھا۔ کہیں کہیں طیور کے چچھانے کا شور بلند تھا اور مغرب کے قللے پر آفتاب کے غروب ہونے کی بھی شعاعیں نظر آ رہی تھیں۔ زمرد نے یہاں رُک کے کہا ”اوہ یہ شام ہوتی۔“

حسین: اس میں کے شک ہو سکتا ہے۔

زمرد: دن کا سماں دیکھے چکے اور شام بھی دیکھے لی۔ صرف رات کا وقت باقی ہے۔ چلو، وہ بھی دکھائے دیتی ہوں۔ یہاں سے واپس آ کے زمرد حسین کو لیے ہوئے ایک پہاڑ کے غار میں داخل ہوئی جہاں نہایت خوبی سے ایک نشیبی راستہ بنا ہوا تھا۔ زینے نہ تھے بلکہ زمین جو پختہ سطح اور رنگ

برنگ کی تھی، ساعت بساعت پنج ہوتی جاتی تھی۔ اس زمین دوز راستے میں جاتے جاتے دونوں ایک نہایت ہی عالیشان اور پر لطف جگہ میں پہنچے، جہاں ہر جگہ کافوری شمعیں روشن تھیں، جھاڑا اور فانوس کثرت سے لٹک رہے تھے اور درود یوار اور شیشے کے رنگ برنگ نکلوں کو ان شمعوں کی شانیں کچھ ایسی عجیب روشنی سے چمکا رہی تھیں کہ نظر خیرہ ہو جاتی تھی۔

زمرد: دیکھو! یہ رات ہے، اور کیسی پیاری رات!

حسین: پیاری زمرد! اگر تو ساتھ ہو تو ہر چیز پیاری ہے۔

یہ سب سامان دیکھ کے دونوں اپے قصر میں واپس آئے اور باہم عشق و محبت کی باتیں کرنے لگے۔ مگر پہلے زمرد اب کسی قدر افسردا ہی تھی۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ زبردستی کوشش کر کے چہرے کو شاش بناتی ہے مگر دل اندر سے بیٹھا جاتا ہے۔ حسین نے اس امر کو حیرت سے دیکھا اور کہا ”زمرد اس فرد وہ میں میں آن تم مجھے ملول نظر آتی ہو؟“

زمرد: نہیں۔ مگر ہاں، گزشتہ مفارقت کسی کسی وقت یاد آ جاتی ہے تو خواہ مخواہ دل بھرا آتا ہے۔

حسین: مگر خدا نے وہ مصیبۃ کاٹ دی ہے اور اب اُمید ہے کہ ہم دونوں ہمیشہ یوں ہی ایک دوسرے کے وصل سے حظ اٹھاتے رہیں گے۔

زمرد: خدا کرے ایسا ہو۔ مگر حسین، مجھے اس کی امید نہیں۔

حسین: (حیرت سے) امید نہیں؟ حیف ہے! یہاں کے اُطف تو سرمدی وابدی ہیں۔ یہاں نہ کسی دشمن کا اندیشہ ہو سکتا ہے، نہ کسی حاسد کے حسد کا۔ پھرنا اُمیدی و حرمت نصیبی کا کیا سبب؟ ﴿لَا تَفْشِطُوا مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ﴾۔

زمرد: بے شک۔ مگر تم یہاں قبل از وقت آئے ہو اور ابدی و سرمدی اُطف اٹھانے کے لیے وہی

لوگ آتے ہیں جو مرنے کے بعد دنیا سے قطع اعلق کر کے آئیں گے۔ تم نے ابھی اس ماذی دنیا کے علاقے قطع نہیں کیے اور اس ماذی جسم کو ساتھ لائے ہو جس کو وہ ہیں دنیا میں چھوڑنے کے لیے تمھیں ایک روز اس عالم میں جانا ضرور ہے۔ دیکھو! حضرت مسیح یہاں زندہ آئے اور اب تک ہیں۔ مگر انہیں کبھی کسی لطف میں پورا مزہ نہیں آتا۔ اس لیے کہ جانتے ہیں کہ یہ قفسِ غدری چھوڑنے کے لیے ایک مرتبہ پھر جانا ہے۔ اصل یہ ہے کہ کثافتِ ماذہ اس نورستان میں نہیں۔  
حسین: افسوس! پھر کب جاؤں گا؟

زمرد: جب حکم ہو جائے۔ مگر مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلدی جانا پڑے گا۔ اس لیے کہ وہاں کی شدید ضرورت میں تمھیں بُلارہی ہیں۔

حسین یہ سن کے آبدیدہ ہو گیا اور نہایت جوشِ دل سے ایک آہ سرد بھر کر بولا:  
روے گل سیر نم دیدیم و بہار آخر شمد

مجھ تو ابھی تیرے وصال کا لطف بھی نہیں حاصل ہوا۔ مگر زمرد! مجھ سے تواب نہ جایا جائے گا۔ اس وقت سے میں ہر وقت تیرا باتھا پنے باتھ میں لیے رہوں گا تاکہ کوئی مجھے تجھ سے جدانہ کرے۔“  
یہ سن کے زمرد بھی آبدیدہ ہو گئی اور بولی ”حسین! یہ امر تمہارے اختیار سے باہر ہے۔ جب وقت آئے گا تمھیں خبر بھی نہ ہو گی اور ادنیٰ غنوڈی گی تمھیں اس عالم میں پہنچا دے گی۔“

حسین: (روکر) تو پھر تو مجھ سے تمہارے فراق کی مصیبت نہ برداشت کی جائے گی۔ جاتے ہی اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالوں گا، اور تم سے چھوٹے ایک گھڑی بھی نہ گزری ہو گی کہ پھر تمہارے پاس پہنچوں گا۔

زمرد: کہیں ایسا غصب نہ کرنا۔ خود بخشی کر لی تو جنت تم پر حرام ہو جائے گی۔ پھر تو قیامت تک

بھی ملنے کی امید نہیں۔

حسین: (زور سے سینے پر باتھو دھر کے) بائے! مجھ سے کیوں کرزندہ رہا جائے گا؟ خدا کے لیے کوئی تدبیر بتاؤ۔ ورنہ سمجھ لو کہ ہمیشہ کے لیے مایوسی ہے۔ اس لیے کے اب دنیا میں جا کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہزار روکو، میرا خبر میرے سینے پر آٹھ ہی جائے گا۔ اچھا اگر یہ نہیں تو تم میرے ساتھ چلو۔

زمرد: یہ تو کسی طرح ممکن ہی نہیں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں اپنے بس میں ہوں۔ اتنا ہی لفظ زبان سے لگا تھا کہ کانپنے لگی اور آٹھ کے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی سُن تو نہیں رہا ہے مگر جب کوئی نظر نہ آیا تو اطمینان سے آ کر بیٹھ گئی اور بولی ”حسین، اب ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے واپس جانے کا وقت آ گیا ہے۔“

حسین: (بے صبری سے چلا کے) کیا؟ ابھی سے؟ نہیں، میں ابھی نہ جاؤں گا۔“ یہ کہہ کے زمرد کو دونوں ہاتھوں سے کھینچ کر پکڑ لیا۔

زمرد: ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ جتنی زیادہ بے صبری دکھاؤ گے، اتنے ہی زیادہ خراب ہو گے۔ اس وقت تہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اسے غیمت سمجھو اور جو میں کہتی ہوں سنو! کوئی آ گیا تو یہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔ عمر بھر کافِ فسوس ملے گے۔ ساری دنیا میں بھٹکتے پھر دے گے اور مطلب نہ نہیں گا۔

حسین: (اپنے آپ کو سنجال کر) اچھا سنتا ہوں۔ پیاری زمرد، تم ہی کوئی تدبیر بتاؤ تو کام چلے گا (یہ جملہ پورا نہ ہونے پایا تھا کہ جی بھر آیا اور زار و قطار رونے لگا۔)

زمرد: (اپنے نازک ہاتھ سے منہ بند کر کے) کیا غصب کرتے ہو! خدا کے لیے سنبھالو۔ دنیا میں

جائے جی بھر کے رو لینا۔ مگر ابھی میری ایک بات ذرا ہوش و حواس درست کر کے سُن لو۔

حسین: (نہ رکنے والے جوش کو روک کے) ہو، پیاری زمرد! دل و جان سے سُن رہا ہوں۔

زمرد: یہاں سے جانے کے بعد پہلے تم کوشش کرنا کرو، ہی لوگ جن کی مدد سے اس دفعہ یہاں آئے انھی لوگوں کی اطاعت کر کے، انھیں خوش کر کے، پھر یہاں آنے کا موقع پاؤ۔ اپنی حاجت روائی کے لیے تم ان کے کسی حکم سے انحراف نہ کرنا اگر وہ تمھیں یہاں بھیجنے کا وعدہ نہ کریں اور سب طرف سے مایوس ہو جاؤ تو پھر اس وادی میں آکے ٹھہر جانا، جہاں میری قبر بے اور جہاں خط بھیج کر میں نے تمھیں یہاں آنے کی تدبیر بتائی تھی۔

حسین: کوہ طالقان میں؟

زمرد: ہاں، ہاں۔ وہیں۔ اگر تم ایک مہینے تک وہاں ٹھہر و گے تو پھر میں کوئی تدبیر بتاؤں گی۔ دیکھو اخبار کسی کوخبر نہ ہو کہ میں نے وہاں بلائیا ہے۔

حسین: مگر پیاری زمرد! وہ تدبیر اسی وقت بتاؤ کہ یہاں سے جاتے ہی اس پر عمل درآمد شروع کر دوں۔

زمرد: افسوس! تم نہیں سمجھ سکتے۔ بس تمھیں وہی کرنا چاہیے جو میں بتاتی ہوں۔ وہ تدبیر اس وقت بتانے کی نہیں۔

حسین: دیکھوں، اب کتنے دن تھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔

زمرد: صبر کرو اور ضبط سے کام او۔ اور خبردار! ایسی کمزوری اور بزدلی نہ دکھانا کہ خود اشی کا ارادہ کرو۔

حسین: میں اسی سے ڈرتا ہوں، پیاری زمرد، تیرے عشق میں بعض وقت اپنے ہوش میں نہیں ہوتا ہوں اور نہ نیک و بد سمجھتا ہوں۔ یہ تیرے لیے ہی تھا کہ میں نے اپنے پچھا اور شیخ الوقت امام نجم

الدین نیشا پوری کو قتل کر دیا۔

زمرد: میں جانتی ہوں، مگر اس میں مجھے شریک نہ کرو (کچھ آہٹ پا کے) اب خاموش رہو۔ ناگہاں چھ سات حوریں ناز و انداز سے قدم رکھتی ہوئی سامنے آئیں اور محبت کے لجھے میں حسین سے کہنے لگیں:

”اب چل کے باہر کی سیر کچے اور ان نورانی تختوں پر جلوہ افروز ہو جیے جو چمنوں کے درمیان میں ہیں۔ اس وقت کی بہار دیکھنے کے قابل ہے۔ شراب طہور کے جاموں میں خاص مزہ ہے۔“  
حسین: میں تو یہاں تنہا ہی اچھا ہوں۔

زمرد: وہاں چلنے میں کیا مصلحت ہے۔ چلو، میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔

حسین: خیر، الگ تمہاری یہی مرضی ہے تو مجھے کیا غدر ہو سکتا ہے۔ اتنی دیر میں اور سب حوریں بھی آگئیں، اور زمرد حسین کو ساتھ لیے قصرِ زمردی کے باہر نکلی۔ سب کے سب لا الہ زار کے درمیان میں طلاقی تختوں پر جا کے بیٹھے۔ تخت کے دونوں جانب دو حوض تھے اور بغیر کہہ صرف واقعات سے یقین دلا دیا جاتا تھا کہ ایک حوض کوڑ اور دوسرا شراب طہور کا ہے۔ سامنے چند حوریں بیٹھے کے عجب دلربا اور وجد میں لانے والی دھن میں گانے لگیں۔ دو چار غلامان یعنی دو بصورت کم عمر کوڑ کے سونے کے جام و صراحی لا کے لکھرے ہو گئے اور نغمہ و سرود کے ساتھ دور بھی چلنے لگا۔ دو جاموں نے حسین پر از خود رفتگی کی کیفیت پیدا کر دی اور جب وہ اس عالم نور کو بے خودی کی نیم بازاں نکھوں سے دیکھ رہا تھا، اُسے نظر آیا کہ زمرد ایک ہاتھ تو اس کے گلے میں ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا ہاتھ سے ایک چھلکتا ہوا جام اس کے منہ سے لگا رہی ہے۔ حسین اس اُطف صحبت کا دل ہی دل میں مزہ اٹھا کے اس جام کو پی گیا مگر پینے کے بعد معلوم ہوا جیسے زمرد کی آنکھوں سے موتیوں کی طرح

آنسوٹپ رہے تھے۔ بے ہودی کے جوش میں پیاری دل ربا کی دل دہی کے لیے بڑھنے ہی کو تھا  
کمد ہوش ہو کر گر پڑا۔ بس اس کے بعد اسے اپنے پرانے کی خبر نہ تھی۔

## پھر وہی عالم عن اصر

دیر کی آزار ساں غفلت و بے ہوشی کے بعد حسین ذرا ہوشیار ہونے لگا تھا کہ کان میں آواز آئی۔ اے جسم خاکی! انٹھا اور اس بزرخ کبریٰ کا باتھ چوم جو تیرا امام ہے اور جس نے تیرے لیے باوجود مجرم ڈھپن ہونے کی صورت ماذی اختیار کر لی ہے۔ حسین نے بے ساختہ آنکھوں کو دی اور بجائے جنت یا زمرد کے پہلو کے اپنے آپ کو اس تاجدار شخص کے سامنے پایا جس کے ہاتھ پر اس نے بیعت کی تھی اور جو اس سفرِ جنت کی آخری منزل پر ملا تھا۔ حسین آنکھیں ملتا ہوا ادب سے انٹھ بیٹھا اور اس کے قدموں پر گر کر سر رکڑ کر کہنے لگا:

ملکِ بیداری میں خوابِ مخدار!

شخص: نہیں۔ تجھے پھر عالمِ ارضی میں جانا ہے۔ میرا یہ باتھ جس میں نور کے ماذے کا بہت کم بجدو ہے، تیرے باتھ سے مل چکا ہے اور ہمیشہ ان لوگوں کے باتھ میں رہتا ہے جن کے وسیلے سے تیری اُس ملائِ اعلیٰ تک رسائی ہوئی۔

حسین: مگر میں ابھی چند روز اور جنت میں رہنے کا آرزو و مند ہوں۔

شخص: اس ماذی عالم کی زندگی میں ممکن نہیں کہ تو اس روحانی عشرت کدے میں جاسکے۔ جا اور اس وقت کا منتظر رہ جب کسی ذیلی کوشش یا امام مرشد کے حکم سے تو جامِ فنا پیے گا۔

حسین: آپ میرے امام ہیں اور آپ ہی جامِ فنا پلا کے مجھے فردوس بریں میں پہنچا دیجیے۔

شخص: یہ ملائِ اعلیٰ کی سرحد ہے اور یہاں فنا نہیں۔

انتہے میں وہی پہلی پرمی وش ناز نہیں لبریز جام باتھ میں لیے ہوئے آئی، جس کے دیکھتے ہی اس

شخص نے کہا ”بس، اب زیادہ چجٹ نہ کر اور یہ شراب طہور کا آخری جام پی۔“ یہ کہہ کے اُس نے جام اپنے ہاتھ سے حسین کی طرف بڑھایا۔

حسین اب جانتا تھا کہ یہ شراب طہور داروئے بے جوشی کا اثر رکھتی ہے اور جس طرح اُس کا نشہ پہلے اُسے عالمِ نور میں لے گیا تھا، اب خصیضِ ظلمت میں لے جائے گا۔ مگر ما یوتی کی تکلیف نے پیاس اس قدر تیز کر دی تھی کہ انکار کی جرأت نہ ہوتی۔ بے تکلف لے کے پی گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں کھول کھول کے وہ مختلف سین دیکھنے لگا جو حیرت زدہ آنکھوں کے سامنے تھے۔

آخر ایک شب کو اس کی آنکھ شیخ الجب کے سامنے کھلی۔ اس پہلے نگہبان نے اس کی پیٹی پر ہاتھ پھیر کے کہا ”حسین! تو پھر اس تیرہ خاک و ان عنصری کے حدود میں آ گیا اور ان آنکھوں سے جو انوارِ مخفہ و مجردہ دیکھ چکی ہیں، پھر نورِ سینا کو اسی طرح ستّرِ جا بلوں میں دیکھ رہا ہے۔“

حسین: (آبدیدہ ہو کے) مگر میں تو اس ظلمتِ خاکی میں نہیں آنا چاہتا تھا۔

طور معنی: بے شک نہ چاہتا ہو گا۔ جذبات نور وحدت ایسی ہی کشش رکھتے ہیں مگر کیوں کر ممکن تھا کہ اس جسمِ خاکی کا دھبا اُس نورستان میں ہمیشہ قائم رہتا۔

حسین: تو تلمذ کو شش کیجیے کہ اسی وقت اس جسمِ خاکی کو چھوڑ کے اُس سرو شہستانِ اعلیٰ کا راستہ کہیں، اُس پر عمل کرو۔

طور معنی: ان امور میں شیخ علی وجودی ہی تمہارا اطمینان کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس جاؤ اور وہ جو کہیں، اُس پر عمل کرو۔

حسین: (جو شِ دل سے نوحہ ڈال کر کے) افسوس! میری اتنی ریاضت اور یہ مدد توں کی آرزو

مندی صرف اتنے مختصر زمانے کے لیے تھی! آہ! کیا کروں کہ پھر زمُر دکا وصال نصیب ہو! یہ کہہ کر وہ پھوٹ پھوٹ کے اور زارقطار رونے لگا اور یہاں تک رویا کہ ہچکیاں بندھ گئیں۔

طوبی معنی: اے بلند حوصلہ مُشت غبار! میرے عزالت کدے کو خالی کر اور صفحہ رہستی پر جا کے اس معیاد و معینہ کو پورا کر، جتنے دنوں کے لیے تو اس ظلمت کدہ ارض میں گرفتار ہے۔

حسین: کاش! یہ بھی معلوم ہوتا کہ اس مُشت غبار کو کب تک اس عالم میں سرگردان پھرنا اور خاک اڑانا ہے۔

طوبی معنی: تیرے لیے ان رموز کا ظاہر کرنا شیخ علی وجودی کا کام ہے۔ اس لیے وہی تیرے مرشد ہیں۔ مگر ہاں، تجھے ایک راز بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ پھر اس عالم نور کی زیارت فقط اس امام کے اختیار میں ہے جو اہوت و ناسوت کا برزخ اور تخلی ہے۔ وہ تخلی جو مختلف جسد ہائے امامت و نبوت میں ظاہر ہوتی رہی۔

حسین: مگر ان تک رسائی کیوں کر ہو سکتی ہے؟ اور ملاعِ اعلیٰ سے پھر میں اس قعر ظلمت میں پھینک دیا گیا تو؟

طوبی معنی: گوآن کامر کو مقرر رہی نورستان اعلیٰ ہے مگر یک گونہ تعلقاتِ مادہ جن کی وجہ سے انہوں نے بہت سے جسد ہائے امامت بدالے، انہیں اکثر اوقات اس آنحضرتیان میں سمجھتی ہے۔ مگر بغیر مرشد کے اس غرض میں کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اگر تو اسرار کرے گا تو تیرے مرشد شیخ علی وجودی تیری اس امر میں مدد کریں گے۔ پس اب تو اس خلوت کدہ نور کو خالی کر اور مرشد کی قدم بوسی کے لیے روانہ ہو۔

اس تقریر نے امید کا ایک ڈھنڈا چڑاغ اس کے سینے میں روشن کیا جس کی روشنی میں وہ غار سے

باہر آکا۔ لیکن اُس کی حیرت کی کوئی انہتانہ تھی جب دیکھا کہ کاظم جنوہی غار کے دہانے پر اسی وضع اور حالت میں لکھڑا ہے جس وضع و حالت میں وہ اسے چھوڑ گیا تھا۔ کاظم جنوہی نے اس کی صورت دیکھتے ہی کہا: ”اب تو تم کو اطمینان ہو گیا کہ شجرِ معرفت کی ایک شاخ تم بھی ہو۔“

حسین: اور آپ یہاں کب آئے؟

کاظم جنوہی: ابھی تمہارے ساتھ ہی آیا ہوں۔

حسین: ابھی؟

کاظم جنوہی: ہاں، ابھی۔

حسین: مجھے تم سے رخصت ہوئے کئی ہفتے گزر گئے۔

کاظم جنوہی: (ہنس کر) اس عالم اور اُس عالم میں بڑا فرق ہے۔ یہاں کا ایک ایک دن وہاں کے متبررس کے برابر ہے۔

حسین: وہ ایک گھری سی، مگر تم یہاں پھرے کیوں رہے؟

کاظم جنوہی: امام قائم قیامت کا حکم یہی تھا۔

حسین: امام قائم قیامت کون؟

کاظم جنوہی: وہی جن کے ہاتھ پر اُس عالم نور کے سفر میں تم نے بیعت کی ہوگی۔

حسین: مگر ان کے ادکام تم تک کیوں کر پہنچ گئے؟

کاظم جنوہی: انھی مُرشد کے ذریعے سے جو راہ طریقت طے کرنے کے لیے میرے اور ان کے درمیان واسطہ ہیں۔

حسین: تو شاید تمہارے مُرشد یہاں آئے ہوں گے؟

کاظم جنوبی: اس کی کچھ ضرورت نہیں۔ وہ ایک توجہ سے اپنے خیالات میرے دل میں پیدا کر دیتے ہیں۔

حسین: افسوس! میں جنت سے زبردستی کھینچ کے نکلا آگیا۔

کاظم جنوبی: ان امورِ ربانی کی شکایت نہ کرو۔ اور ان کے مصالح دریافت کرنا ہیں تو اپنے مرشد شیخ شریف علی وجودی کے پاس جاؤ۔ مگر یہ یاد رکھنا کہ اب تم عالم نور کی سیر کر آئے ہو، لہذا ان کو اسی روحاںی لقب سے یاد کرنا جو اس سرو شہستان میں مشہور ہے۔

حسین: کیا ان کا کوئی اور بھی لقب ہے؟ میں نے سننا نہیں۔

کاظم جنوبی: ہاں، اس عالمِ عناصر میں تو ان کا نام یہی ہے جو تم جانتے ہو، مگر اس عالمِ نور میں وادیِ ایمن کہے جاتے ہیں۔

حسین: (تعجب سے) وادیِ ایمن! (اور پھر سوچ کے) بے شک، انہیں وادیِ ایمن ہی کہنا چاہیے۔

انھی کے پہلو میں نور کی حقیقت کی پہلی شعاعِ نظر آئی۔

کاظم جنوبی: بس، اب چلو اور حاب کا ارادہ کرو۔

حسین: مگر مجھے اتنا ضرور بتا دیجیے کہ اس عالمِ نور میں کبھی پھر بھی میرا گُور ہو سکے گا؟

کاظم جنوبی: اس امر میں کوئی شک نہیں کر سکتا۔ مگر ہاں، یقینی ہے کہ اگر تمھارے مرشد کی توجہ ہو تو سب با تین ممکن ہیں۔

کاظم جنوبی نے اس ٹھملے سے حسین کے سینے میں امید کے چراغ کو ذرا اور اکسا دیا۔ آخر دونوں نے اس وحشت ناک مسکنِ دام و در کو چھوڑا اور شہر اصفہان میں آئے۔ کاظم جنوبی نے اپنی مسجد

کے دروازے پر پہنچتے ہی آواز لگائی ”دھیں سگ بہ قمہ دوختہ ہے“ جس کے بعد حسین نے اُسے رخصت کیا اور شہر حلب کی راہ لی۔

اس سفر میں حسین ہر وقت جنت اور اس کی حوروں کی ادھیر بُن میں رہتا۔ اگرچہ اس کا جسم اس دنیا میں تھا لیکن اُس کے خیالات اور اس کے اعتقاد میں اُس کی روح علیٰ اللہ وَ آمِ اُس دوسرے عالم نور کے مزے یقین رہتی۔ وہ خیال میں کہتا ہے<sup>۱۲</sup> تنه انقلابات کے بعد اب مجھے تو یہ معلوم ہو گیا کہ

”مُوْثُوْ أَقْبَلَ آنَ تَمُوْثُوَا“ کے کیا معنی ہیں یا اس دنیا میں رہنے سبھے کے ساتھ انسان اس عنصرستان سے قطع اعلق کر کے اپنی زندگی کا زیادہ حصہ عالم ملکوت میں کیوں کر صرف کرتا ہے۔ اب اس مرتبہ جب کہ وہ اصفہان سے حلب کو جا رہا تھا، اُسے ایک بہت ہی نئی حرمت میں ڈالنے والی چیز نظر آئی۔ وہ حس گاؤں یادشتو و دہ میں گزرتا، اکثر لوگ خود بخود اسے پہچان لیتے کہ جنت کی سیر کر آیا ہے اور پاس آ کے مبارک باد دیتے۔ وہ دل میں پریشان تھا کہ یہ کیا بات ہے اور کون ہی عالمت ہے جس کی وجہ سے لوگوں کو میری حالت معلوم ہو جاتی ہے! بعض لوگوں سے اس راز کو دریافت بھی کیا مگر کسی نے ٹھجھنہ بتایا، زمرد اب اس کے دل و دماغ پر پہلے سے زیادہ حاوی تھی۔ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جا گئے ہر حالت میں اس کی دلفریب تصویر پیش نظر رہتی۔ کبھی اپنی طرف بُلاتی تھی اور کبھی صبر و تحمل کی تاکید کرتی تھی۔ یہی پریشان کن خواب دیکھتا ہوا شہر حلب میں پہنچا اور شیخ علی وجودی کے سامنے جاتے ہی ان کے قدموں پر گرا۔ شیخ نے اٹھا کے پیشانی پُجومی اور پیٹھ ٹھونک کے اپنے برادر بٹھایا اور کہا<sup>۱۳</sup> ”حسین! تو لا ہوت اکبر کی سیر کر آیا۔“

حسین: یا شیخ! اُس عالم نور کی میں نے پوری کیفیت دیکھ لی ہے اور اے وادی ایمن! تیرے

پہلو میں مجھے وہ جلوہ نظر آ گیا جس کے اشتیاق کے سوال پر موی کو بھی ”لُکن ترانی“ کا جواب ملا تھا۔ مگر کیا کہوں کہ میں نے کن حرتوں سے اس ذہن نور کو چھوڑا ہے۔

شیخ: اے تیرہ و تار مشت غبار! بتاتو نے وہاں کیا دیکھا؟

حسین: ایسا کچھ دیکھا کہ آنکھوں کو تمنا رہ گئی۔

شیخ: جذباتِ نور ایسے ہی ہوتے ہیں۔ زمر دے ملا تھا؟

حسین: (شیخ کے قدم چوم کے) ملا تھا۔ آہ! جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ وہ نظر کے سامنے سے غائب ہو گئی۔

شیخ: مگر تیرا جسم خاکی اس نورستان میں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ اگر چ تو کہتا ہے مجھے یقین ہے کہ اس عالم نور کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔ مگر اے حسین، میں کہتا ہوں کہ تو نہیں دیکھا۔

حسین: نہیں، اے شیخ اور اے وادی ایکم! میں نے دیکھا اور اپنی آنکھوں سے اس وقت دیکھ رہا ہوں۔

حسین کا یہ جواب سخت ہی شیخ کو جاں گیا۔ منه میں کاف بھرا آیا۔ آنکھیں سرخ ہو گئیں۔ وہ جوش میں آ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حسین مارے خوف کے سر سے پاؤں تک کانپ گیا۔ انہوں نے کہنا شروع کیا ”اے مغلبر و مغرو مشت خاک! تیری کیا مجال کہ اس نورِ لمبیز لکوانِ ذلیل آنکھوں سے دیکھ سکے۔ تیرے جسم کے سامنے وہ تو غیر متغیر بن کے نمایاں ہوا تھا۔ اس کی اصلی گیفیات کو تیری یہ آنکھیں کسی طرح معلوم نہیں کر سکتی تھیں۔ مگر ہاں، تو اس کو دیکھے گا اور اس کی اصلی حالت و گیفیت میں دیکھے گا۔ مگر کب؟ اس جسم خاکی کو چھوڑ کے اور مجرِ محض بن کے۔ اس وقت تجھے یہ بھی نظر آ جائے گا کہ اسی نورِ ازل کا چراغ تو بھی ہے۔“

حسین: (کا نیقی آواز سے) مگر میں تو ابھی وہاں سے آنا نہیں چاہتا تھا۔

شیخ: بے شک نہ آنا چاہتا ہو گا۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔ نور کشافت ماڈل کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

حسین: لیکن اے شیخ! آپ وادی ایمن ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پھر اس عالم نور میں جا سکتا ہوں۔ آہ! زمرد کے لیے بہت پریشان ہوں۔

شیخ: (پھر طیش میں آ کے) اگر ہوں اس استہمیں قدر بس است۔ اس سرو شہستان کو بے دیکھے قبول کرنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی۔ آگ میں کسی ماڈل چیز کو ڈال دو تو وہ اپنا تصرف کرنے کے بعد باقی ماندہ کشاфт کو الگ پھینک دیتی ہے۔ اسی طرح نورستان نے تیرے جسم کو اپنے حیز سے نکال کے پھینک دیا ہے۔

حسین: تو پھر آپ ہی اپنے ہاتھ سے مجھے اس جسم خاکی کی قید سے آزاد کیجیے تاکہ تحرداً اختیار کر کے جاؤں اور پیاری زمرد کو اپنے آغوش میں لے لوں۔ کیا عجب کہ اس وقت تک وہ میرے شوق میں اپنا آغوش پھیلائے ہوئے ہو۔

شیخ: اب وہاں تک تیری رسائی امام قائم قیامت کی دشیگری سے ہو سکتی ہے۔

حسین: گوئیں اس برزخ کبریٰ کے ہاتھ پر بیعت کر چکا ہوں مگر اس درگاہ میں میری رسائی اسی وقت ہو گی جب آپ میری مدد کریں۔ آپ کی دشیگری سب پر مقدم ہے۔

شیخ: اچھا، مایوس نہ ہو، مجھے تیرا ایک دفعہ اور امتحان لیما ہے۔ اگر تو اس امتحان میں پورا اُتر اتو میں تجھے اس دربار امامت میں سفارش کے ساتھ پہنچا دوں گا۔

حسین: جلدی فرمائیے۔ جو حکم ہو، اس کو بجا لانے کو تیار ہوں۔ موت کا سب سے زیادہ آرزو مند ہوں۔ اگر اس امتحان میں مجھے موت نصیب ہو گئی تو اس سے زیادہ میری کیا خوش قسمتی ہے۔

شیخ: اسی وقت شہر دمشق کی راہ لے اور جس طرح بنے امام نصر بن احمد کو جو ہم باطنیین کے خلاف وعظ کہا کرتے ہیں، قتل کر کے واپس آ۔

حسین: ابھی چلا۔ مگر مجھے اتنا اور بتاؤ بیجیے کہ کیا ہم ہی وہ باطنیین ہیں جن کو کبھی لوگ قرامطہ کے اور کبھی ملاحدہ کے نام سے یاد کرتے ہیں؟

شیخ: بے شک۔ ہم اسماعیل بن جعفر صادقؑ کی امامت کے مدعی ہیں۔ اور چونکہ امامت ظاہر ہو گئی، لہذا ہم پر فرض ہے کہ اس کی تبلیغ و نقاہت خفیہ اور باطنی طریقوں سے کریں۔ انوارِ ازال نے یہ قدیم ہی سے فیصلہ کر دیا ہے کہ جب تک امامت ظاہر رہتی ہے، نقاہت و تبلیغ خفیہ ہوتی ہے، اور جب امامت مخفی و باطنی ہو جاتی ہے تو نقاہت و تبلیغ علانیہ ہونے لگتی ہے۔

حسین: مگر اس کا سبب میرے ناقص فہم سے بالآخر ہے۔

شیخ: بے شک بالآخر ہے (زور سے گھور کے) اور تیرے جاہلانہ شکوک اسے اور زیادہ بالا کرتے جاتے ہیں۔ خود خدا کی طرف خیال لے جا کر وہ مخفی ہے اور اسی لیے اس کی توجہ کی تبلیغ علانیہ ہوتی ہے۔

حسین: یا وادی ایمن! نبوت تو ظاہر ہی اور اس کے ظہور کے زمانے میں بدابد علانیہ تبلیغ ہوتی تھی۔

شیخ علی وجودی کے منہ میں کف بھرا آیا۔ سخت برہمی کے لبھے میں وہ چلا نئے۔ ابھی تک شیطان تیرے دل میں بیٹھا ہے، وہ تجھے بہکار رہا ہے اور عالمِ نور میں جانے کی آرزو رکھتا ہے۔ سن! اس نظام کا تعلق صرف امامت سے ہے۔ نبوت ہمیشہ ظاہر ہی اور ظہور کے زمانے میں علانیہ تبلیغ ہوتی رہی۔ نبوت اور رسالت کس چیز کی طرف لوگوں کو بُلاتی ہے؟ خدا کی طرف اور فردوسِ بریں کی

طرف۔ اور یہ دونوں دنیا کی نظر میں مخفی ہیں۔

حسین: (ڈرتے ڈرتے) مگر امامت بھی تو انھی چیزوں کی طرف بُلاتی ہے۔

اب شیخ کو غصے نے آپ سے باہر کر دیا۔ ایک دفعہ چمک کے اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا "تو عالم ہو رکی سیر کرنے پر بھی جاہل اور شکلی ہے۔ عہدِ نبوت میں جنت اور نور الانوار اس قدر نمایاں نہ تھے جتنے کہ اب عہدِ امامت میں ہیں۔" رہالت نے کبھی کسی ماڈی پیکر کو اس سرو شہستان میں نہیں بھیجا اور امامت برادر بھیج رہی ہے، جس کا یہ قطعی نتیجہ ہے کہ فردوس بریں اور نورا زلی پہلے مخفی تھے اور اب نمایاں ہیں۔ اور چونکہ اب نمایاں ہیں لہذا اتباع اور نقاہت کو خفیہ طریقوں سے ہی اپنا عمل کرنا چاہیے۔

حسین: یا وادیِ ایمن! اب مجھے اطمینان ہو گیا۔ اور ضرور تھا کہ اپنے شکوہ رفع کرتا۔ اس لیے کہ میں نے اس مذہب کی نسبت بہت سی بے سروپا باتیں سنی تھیں۔ سنا تھا کہ الموت کے قلعے میں لوگ طرح طرح کے فریبوں سے اس مذہب کے پابند بنائیے جاتے ہیں۔

شیخ: یہ دشمنوں اور ہماری کی افتراء پر داریاں ہیں۔ ایسے لوگ جن کو پشم بصیرت نہیں اور انوار از لیہ کے سامنے دھاش سے زیادہ وقت نہیں رکھتے، ان کے کہنے کا کیا اعتبار۔ اتنے مدارج یقین طے کر کے تجھے نظر آ گیا ہو گا کہ ہم کس ملائے اعلیٰ پر ہیں اور کس آسمانی سے سرو شہستان کی سیر کرتے ہیں۔ اور وہ کس قعرِ جہالت میں پڑے ہیں اور کس تجھٹِ الخرمی کی طرف روز بروز زیادہ دھستے چلے جاتے ہیں۔

حسین: مجھے معلوم ہے۔

یہ کہہ کر حسین شیخ سے رخصت ہوا اور امام نصر بن احمد کی جان لینے کے لیے دمشق کی راہیں۔

حسین اب ایسے کاموں کے لیے جری تھا۔ پہلے موقع پر جوشہ بات اُس کے دل میں پیدا ہوئے تھے، اب نام کو بھی نہ تھے۔ اس کو یقین تھا کہ جنت یقیناً ان لوگوں کے ہاتھ میں ہے جن کا وہ معتقد ہے۔ اور ان کے اشارے پر بُرے بھلے کام کا کرنا ہی ذریعہ نجات ہے۔ باوجود اس کے ایک جلیل القدر عالم کے قتل میں اُس کے دل نے کسی قدر پس و پیش ضرور کیا۔ مگر شیخ اور زمُرد کے خیال نے پھر اس کا دل آگے بڑھایا۔ وہ نہایت سُنگ دلی کے ساتھ مُرشد کے وحشیانہ حکم کی تعمیل کے لیے دشمن میں پہنچا اور امام نصر کے عقیدت کیشوں میں شامل ہو گیا۔

اس سفر میں بھی وہ حیرت سے دیکھتا تھا کہ بعض لوگ را ہچلتے چلتے پہچان کر اُس سے بغلگیر ہوتے اور یک جتنی واخوت کا ثبوت دیتے، جس سے اسے یہ بھی نظر آ جاتا تھا کہ اس کے ہم عقیدہ وہم خیال کس کثرت سے دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں۔ خوش نصیبی یادل کی بے صبری سے مہینے ہی بھر میں اسے اپنی غرض حاصل کرنے کا موقع مل گیا۔ ایک رات پچھلے پھر جب کہ امام نصر پڑوں کی مسجد میں اور سب سے چھپائے کے لیے اندر ہیرے میں تنہا لکھڑے نمازِ تجداد ادا کر رہے تھے، حسین کا نجھر ان کے دل میں اتر گیا۔ جب لاش بالکل سختدی ہو گئی تو پچھلی رات کے سنائے ہی میں مسجد سے نکل کے چلا گیا اور راستے میں ایک نہر کے کنارے بیٹھ کے اپنے کپڑے دھو کر حاب گوروانہ ہوا۔

شیخ علی وجودی نے اس کی کارکردگی کی داد دی اور اس کی پیٹھ گھونک کے کہا کہ حسین تو مرا حل یقین کو بہت جلد طے کر رہا ہے اور اپنے اغراض میں کامیاب ہو گا۔

حسین: یاد دی ایمِن: مجھے ایک امر پر بڑی حیرت ہے، میں جہاں جاتا ہوں اور جس جگہ جاتا ہوں،

میرے ہم خیال و ہم عقیدہ صورت دیکھتے ہی مجھے پہچان لیتے ہیں اور میں ان کو نہیں پہچان سکتا۔  
یہ سنتے ہی شیخ نے ایک صندوق سے ایک آئینہ نکالا اور اسے دکھا کر کہا کہ اپنی صورت دیکھ، تجھے  
اپنے چہرے پر کوئی چیز نظر آتی ہے؟

حسین: ہاں، پیشانی پر داش ہے۔ مگر معلوم نہیں کیسا داش ہے۔ شاید بچپن میں کبھی کہیں گر پڑا  
ہوں گا۔

شیخ: (مسکرا کے) نہیں۔ یہ جور کے بو سے کا نشان ہے۔ یہی ایک مہر ہے جو ہمیشہ اس بات کا  
ثبوت دیتی ہے کہ انسان اپنے نفسِ عنصری کے ساتھ فردوس بریں کی سیر کر آیا ہے۔

حسین: تو جن لوگوں نے مجھے پہچانا، غالباً ان کی پیشانیوں پر بھی جور کے بو سے کا نشان موجود  
ہو گا۔

شیخ: بے شک ہو گا۔ اور حسین! دیکھ میری پیشانی پر موجود ہے۔

حسین: (شیخ کی پیشانی پر بھی وہی اپنا سادائش دیکھ کر) بے شک۔ یہ مدارج یقین طے کرنے کا  
تمغاء ہے۔

شیخ: حسین! یہ بہت بڑی چیز ہے۔ مر نے کے بعد سب مومنین جنت میں جائیں گے۔ مگر جو  
لوگ دنیاوی زندگی ہی میں اس مرکب نور کی سیر کر چکے ہیں، ان کا یہ خروہاں بھی موجود رہے گا۔ یہ  
داش وہاں پیشانیوں پر نور کی طرح چمکے گا اور عام ناجیوں میں ہم لوگوں کو ممتاز ثابت کرے گا۔

حسین: مگر مجھے یہ داش دنیا ہی میں عزیز ہے۔ کاش! میرے لب میری پیشانی تک پہنچ سکتے  
کہ میں اس داش کو بو سے دے کے اپنے دل کی تسلی کرتا۔ میری پیشانی پر سوائے زمرد کے اور  
کسی کے بو سے کا نشان نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے بو سے لیے ہیں تو صرف اُسی کے لب لعلمیں

نے۔ مگر افسوس! جس طرح زمر دمیرے دل میں ہے، ہاتھ میں نہیں آ سکتی، اسی طرح اس کے بوئے کا نشان ہر وقت میرے پاس ہے اور مجال نہیں کہ اپنے مشتاق ہونٹوں کو وہاں تک پہنچا سکوں۔

شیخ: اب ان شاعرانہ خیالات کو دور کرو اور امام قائم قیامت کی قدم بوتی کیلنے تیار ہو جاؤ۔  
حسین: لمیک! مگر اے وادی! یعنی! اتنا اور بتا دیجیے کہ ان کو امام قائم قیامت کیوں کہتے ہیں؟

شیخ: یہ بھی رموز ربانی میں سے ایک ذمہ ہے۔ تجھے شاید ابھی تک ان ائمہ کے نام بھی نہیں معلوم نہ ہوں گے جو نورِ لمبیں کی شعائیں ہیں اور مختلف جسدوں سے نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ یہی ائمہ ہمیشہ ناسوت اکبر ہوتے رہتے ہیں۔ وہی وجود آدم، نوح۔ ابراہیم، موسیٰ، داؤد، سلیمان، عیسیٰ اور محمد صلوات اللہ علیہم اجمعین کے اجسام مطہرہ سے جلوہ فلان ہوتا رہتا تھا۔ آخر علی مرتضیٰ کے جسد انوں میں نمودار ہوا۔ اور چونکہ اب نبوت ختم ہو چکی تھی، لہذا ایک روح نے مختلف اجسام بد لئے شروع کیے۔ پھر حسین اور علی زین العابدین و محمد باقر علیہم السلام کے اجسام کی سیر کرتے کرتے وہ نور جناب جعفر صادق کے جسد انوں سے نمایاں ہوا اور وہ زندہ ہی تھے کہ ان کے پیکر جسدی کو چھوڑ کے پہلے جناب اسماعیل میں پھر محمد مکتوم ابن اسماعیل میں جو ساعج امام تھے آیا۔ چند روز تک وہ نور سلسلہ وار امام منصور بن محمد مکتوم جعفر صادق اور حبیب بن جعفر کے اجسام مطہرہ میں خفیہ ہی خفیہ لمعہ فلان رہا۔ جناب اسماعیل سے اس وقت تک امامت مخفی ہی رہی۔

اب یکا کیک اس نور نے تعبید اللہ مہدی کی ذات سے نمایاں ہو کے اپنی پوری تنور دکھادی اور امامت ظاہر ہو گئی۔ اس کے بعد سے وہ نور برادر علائیہ طور پر مختلف اجسام ظاہرہ کو بدلتا رہا۔ پہلے قائم

بامر اللہ کے جسم سے، پھر منصور کے پھر مغزالین اللہ کے جسم سے چمکا۔ متقر باللہ کے بعد پھر حسن بن محمد یعنی علیہ السلام پھر محمد بن علی علیہ السلام کے جسموں کے لا بیت کبریٰ کا درجہ پایا اور فی الحال وہی انوارِ ازلی رکن الدین خورشاد کے جمال جہاں آ رائے نمودار ہیں جو فرمائز وائے الموت ہیں۔ وہ امام قائم قیامت برزخِ اکبر ہیں اور الہوت و ناؤت و تجلی ہیں جو مختلف جسد ہائے امامت و ثبوت سے لمعہ فلکیں رہی ہیں۔

حسین: (حیرت سے) وہی جن کے ہاتھ پر میں نے اس عالمِ الہوت میں بیعت کی تھی؟  
شیخ: وہی۔

حسین: مگر آپ تو فرماتے ہیں کہ وہ الموت کے فرماں روایتیں؟  
شیخ: بے شک۔ مگر یہ علاقی دنیوی ان کے تحرداً اور ان کی اس نورانیت کو جو عالمِ سردوش میں لے جاتی ہے، وہ نہیں کر سکتے۔ امامِ دینی اور عام ا لوگوں میں یہی فرق ہے کہ جس چیز کو ہم ریاضت سے حاصل نہیں کر سکتے وہ انھیں بد رجہ اتم حاصل رہتی ہے۔ اس لحاظ سے وہ علمیں برزخ کہے جاتے ہیں۔

حسین: اور وہ امام قائم قیامت کیوں کھلا تے ہیں؟  
شیخ: (کسی قدر برہم ہوتے ہوئے رُک کر) ہاں۔ میں نے اس کارازِ بھی نہیں بتایا۔ اما میں مستنصر وزنار کے عہد میں ان میں انوارِ ازلی کی ایک نئی اور غیر معمولی شعر و شیوه ہوئی تھی۔ گویا شیع دراصل قدیم نورِ امامت کا انعکاس تھی مگر اتنا بڑا انعکاس کامل کہ اس کے جلوے سے تمام ممالک ارض چمک اٹھے۔ اس سے وہ چراغ نور مراد بے جو صباح کے جسمِ صافی میں چمکا تھا۔ یہ لقب قائم قیامت اسی آئینہ پر تو نورِ ایزدی کا ہے جس نے یہاں کیک حصہ دارِ اعلیٰ اور نورستان میں

پہنچ جانے کے اتنے صحیح ذریعے مخلوق میں پیدا کر دیے کہ ادنیٰ لوگوں کو وہ کمال حاصل ہو گیا جو گز شستہ عبدوں میں انبیاء اور ائمہ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھا۔ پہلے کوئی فردوس بہریں میں جانے کا خیال بھی نہ کر سکتا تھا مگر اب اس اعلیٰ پر تو ایزدی کو ظہور کے بعد یہ حالت ہے کہ میں آنکھیں بند کر کے ایک دم میں اُس عالمِ نور کی سیر کر آتا ہوں۔ اور تم بھی اس سرو شہستان میں جانے کے ہوروں کی ہم کناری کامزہ اٹھا آئے ہو۔ قیامت کے معنی ظاہر پرستوں میں اس وقت کے ہیں جب کہ دنیا کی زندگی ختم ہو جائے گی۔ مگر حقیقتِ شناس جانتے ہیں کہ قیامت صرف اُس حالت یا اُس وقت کا نام ہے جب کہ مخلوق کو خالق سے یا پرتو کو نور سے قربت ہو جائے۔ حسن بن صباح نے چوں کہ اپنے عبده سے مخلوق کو ایسے تقریب کے درجے پر پہنچا دیا لہذا وہ امامِ قائم قیامت کہلاتے ہیں یعنی وہ امامت جس کی بدولت مخلوق اور خالق میں قربت ہو گئی اور اسی قربت کا نتیجہ ہے کہ ان کے چند ہی روز بعد امام علیؑ ذا کرمه السلام میں امامتِ قدیمة جو جناب علیؑ مرتضی سے نساً بعد نسلِ چلی آتی تھی۔ نیز وہ امامتِ قائم قیامت جس کا چراغ پہلے پہل حسن بن صباح کے اندر میں روشن ہوا دونوں امامتیں جمع ہو گئیں۔ اور یہاں کیک انوارِ نور یعنی بیجان میں آگئے۔ بس اسی دن سے تمام تکلیفاتِ شرعیہ بندوں پر سے انعامی گئیں۔ رمضان کی ۲۷ کو اس قربت پر نور کا جلوہ نظر آیا تھا اور مومنین شرعی ان قیدوں سے آزاد ہوئے تھے۔ اسی سبب سے وہ دن ہمارے لیے عید ہے۔

حسین: (متغیر ہو کے) مگر میں تو دیکھتا ہوں کہ آپ شب و روز ریاضت ہی میں مشغول رہتے ہیں اور آپ ہی کی طرح اس فرقۃ ناجیہ کے جتنے پیروں مجھے ملے، سب پابند شرع، برڑے مختار اور برڑے متفق و پرہیز گا نظر آئے۔

**شیخ:** جو لوگ عرفان و حقیقت کے مدارن طے کرنا چاہتے ہیں، ان کو مشکلاتِ ریاضت طے کرنی پڑتی ہیں۔ مگر مومنین پر فرض اب کوئی عبادت نہیں۔ خاصتہ ان برگزیدگانِ کم ریزی کے لیے جو امام قیامت سے تقریب رکھتے ہوں۔

**حسین:** مگر اے وادی! ایمن! میرا دل آپ کی توجہ کا محتاج ہے۔ تکلیفات شرعیہ کا اٹھا دینا ایک ایسی چیز ہے جس سے میرے دل میں شک پیدا ہوتے ہیں۔

**شیخ:** (برہمنی کے ساتھ) اتنے مدارن طے کرنے پر بھی شک؟ سرو شہستانِ عالمِ نور کی سیر کر چکنے کے بعد شک؟ اب یہ شک نہیں، گستاخی ہے۔ جانتا ہے کہ ساری عبادتیں خدا و نبی جل و علی کی قربت حاصل کرنے کے لیے ہیں۔ اور جب وہ قربت حاصل ہو جائے تو پھر کسی عبادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ تم نے ساپے اور دیکھ بھی لیا ہوا گا کہ جنت میں کوئی شخص عبادت کا مقابلہ نہیں۔ اس کا یہی مفہوم ہے کہ تم قرب بانوارِ کم ریزی کے لیے عبادت کرتے ہیں اور وہاں ہر ایک کو یوں ہی حاصل ہوتا ہے۔

**حسین:** بے شک۔ وہ منزلِ مقصود بے اور عبادت اس کا راست۔ جنت میں پہنچ جانے کے بعد فی الحقیقت کسی عبادت کی ضرورت نہیں۔ لیکن جو لوگ ابھی اس کے باہر ہیں ان کی نسبت نہیں کہا جاسکتا کہ منزلِ مقصود کو پہنچ گئے یا چل رہے ہیں یا اس راستے میں ہیں لہذا ان کو عبادت کی بھی ضرورت ہے۔

**شیخ:** (اپنے سے زیادہ از خود رفتہ ہو کے اور منہ میں کف بھرا کے) اس پیکرِ خاکی کو شعبہات ہی نے خراب کیا ہے۔ یہ برادر شک کرتا ہے اور اپنے شکلوں میں بڑا ضمہدی ہے۔ سن اے حسین! امام قائم قیامت نے جو اپنے آپ کو بتایا کہ وہ اس عالمِ نور میں ہیں اور جزوِ عنصری سے باہر اس

کے یہی معنی تھے۔ گو بظاہر ان کا جسد اس عالمِ مادی میں نظر آتا ہے مگر دراصل وہ ان مادیات سے دور سرو شہستانِ اعلیٰ میں ہیں اور ان سے ملنے اور ان کے جوار میں رہنے کے یہی معنی ہیں کہ گویا انسان اس تیرہ نکمتوں کدھ ارض سے نکل کر لا ہوتا اکبر کے قریب جا پہنچا۔ پھر وہاں پہنچ جانے کے بعد عبادت کیسی؟

حسین: بجا ہے۔ میرا شہر دور ہو گیا۔ آپ کی تقریر سے ہمیشہ ایسے شکوہ دُور ہو جاتے ہیں، اور یہی اطمینان حاصل کرنے کے لیے میں اپنے شہبوں کو با اتنا مُمل آپ کی خدمت میں عرض کر دیتا ہوں۔

شیخ: خیر، تم اس امتحان میں بھی پورے اُترے ہو۔ اب تم کو امام علیہ السلام کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ جاؤ اور ان کے احکام کی بلا غدر اطاعت کرو۔ آج صفر کی ۲۰ ہے۔ رمضان کی ۷۲ کو عید قاسم قیامت ہو گی۔ اس تاریخ کو میں بھی وہاں آؤں گا اور شیخ طورِ معنی بھی وہاں موجود ہوں گے۔ اگر اتنے دنوں میں تم نے امام قاسم قیامت پر اپنی عقیدت کیسی واطاعت کا پورا اثر ڈال دیا تو میں تمھاری سفارش کروں گا اور طورِ معنی بھی کریں گے۔ اور اسی وقت تم کو زمرہ سے ملنے میں کامیابی بھی حاصل ہو گی۔ مگر خیال رکھو کہ اس اعلیٰ دربار میں انسان کے سر سے بہت سے تکلیفاتِ شرعیہ اٹھ جاتے ہیں۔ وہاں کی اطاعت و عبادت صرف انقیاد ہے۔ اگر اس میں کوتا ہی ہوئی تو پھر اس کا علاج نہ میرے پاس ہے نہ کسی اور شخص کے پاس۔ اس درگاہ کا رانمہ مزدود از لی اور رحمتِ الہی سے ہمیشہ کے لیے محروم ہے۔

حسین: میں کسی حکم سے سرنہ پھیروں گا۔

شیخ: وہ ایسا مقام ہی نہیں جہاں تم اپنے دل کے شکوہ کو اسی بے تکلفی سے ظاہر کرو جس طرح

میرے سامنے کرتے ہو۔

حسین: کبھی کسی امر میں شک نہ کروں گا۔

شیخ: اگر اتنے مضبوط ہو تو کل صحیح تم یہاں سے روانہ ہو کر الموت کی راہ لو۔ میں ایک خط لکھ دوں گا۔ اسے لے کر امام کی خدمت میں حاضر ہونا اور جب تک وہاں سے یا مجھ سے کوئی حلم نہ ملے، اس دربار کو نہ چھوڑنا۔

حسین: ہرگز نہیں (یہ کہہ کے اس نے شیخ کے قدم چوم لیے)۔

دوسرے دن علی الصباح وہ شیخ علی وجودی سے خط سفارشی لے کے رخصت ہوا اور مشرق کی راہ لی۔ پندرہ روز میں بغداد واصفہان ہوتا ہوا علاقہ روڈ بار میں پہنچا۔ اس سفر میں وہ اپنے ہم مذہبیوں کو چھوڑوں کے بوسوں کے نشان سے بے کچھ کہے سنبھال پہنچا۔ اس سفر میں وہ اپنے ہم مذہبیوں کو اور اس کے ساتھ نہایت ہی خلوص و عقیدت سے پیش آتے تھے۔ ویلم کے ایک گاؤں میں ایک باطنی شخص جو اپنی پیشانی کے نشان سے بتارہا تھا کہ وہ بھی جنت الفردوس کی ہوا کھا آیا ہے، حسین کو نہایت ہی خلوص و پاک دلی سے اپنے گھر لے گیا اور کئی دن تک مہمان رکھا۔

اس شخص کے گھر پر ایک صحبت میں کئی ایسے باطنی جمع ہوئے جن کو اسی دو سال کے اندر جنت کی ہوا کھلانی گئی تھی۔ لوگوں نے صحبت کو اغیار سے خالی اور اپنے ہم عقیدہ و ہم خیال لوگوں ہی پر محدود دیکھ کے باہر جنت کا تذکرہ شروع کیا۔ اثنائے کلام میں ایک شخص بولا ”مگر مجھے جنت میں بھی ایک تمنا رہ گئی۔“

دوسرا: (حیرت سے) وہ کیا؟

پہلا: وہاں ایک ایسی دل فریب ناز نہیں نظر آئی کہ دل بے اختیار باتھ سے نکل گیا۔ لیکن خدا

جانے کیا بات تھی کہ ہزار کوشش کی مگر اس آفت زمانہ ہورنے بات کا جواب تک نہ دیا۔

دوسرا: واقعی تعجب کا مقام ہے۔ جنت میں تو ایسا نہ ہونا چاہیے۔ کسی ہور کی طرف تمہارے دل کا میلان ہوا اور وہ اتفاقات نہ کرے تو یقیناً سارا الطف خاک میں مل جائے گا۔

یہ سن کر ایک تیرا شخص بول اٹھا، "حقیقت میں اس قسم کے بعض فحصانات وہاں انسان کو نظر آ جاتے ہیں۔ اس مسئلے کو میں نے شیخ کے سامنے بھی پیش کیا تھا جنہوں نے بہت آسانی سے میراطمینان کر دیا۔ انہوں نے بڑے جوش و خروش سے کہا تھا اور گویا اس وقت بھی میرے کان میں کہہ رہے ہیں کہ تم اپنے ماڈی پیکر کے ساتھ ہزار بائشنا فتیں اور دنایتیں لے کے تو اس عالم نور میں جاتے ہوا اور پھر امید کرتے ہو کہ سر و شہستان کو اسی پاک و مجر و حشیثت سے دیکھو جس طرح غیر ماڈی آنکھیں دیکھتی ہیں، خود تمہارے فحصان اور تمہارے ماڈی بخوبی ہیں جو اس حیر نور کو معیوب دکھاتے ہیں۔

پہلا: اور وہاں میں نے یہ بھی سُنا تھا کہ اس ہور میں ذاتاً فحصان موجود تھا، پھر تم کو اپنی ماڈی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا تھا۔

دوسرا: بے شک۔ یہی سبب ہو گا۔ اول تو اس ہور میں ذاتاً فحصان موجود تھا، پھر ہمیں اپنی ماڈی آنکھوں سے اور زیادہ بدنما نظر آیا۔

حسین: (کسی قدر تعلق خاطر سے) اور کچھ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس ہور کا نام کیا تھا؟

پہلا: ہاں۔ مجھے بتایا گیا کہ اس کا نام زمرد ہے۔ اور میری ہور نے جس کے آغوش کا مزہ زندگی بھرنہ بھولے گا، یہ بھی بتایا کہ اسے کسی خاکی پیکر سے اس قدر تعلق ہے کہ جنت کی سیر کرنے والوں میں کسی کی طرف اتفاقات نہیں کرتی۔

دوسرے دن حسین یہاں سے رخصت ہو کر آگے روانہ ہوا اور دو ہی چار روز میں قاعدہ الموت کے

پھانک پر کھڑا تھا۔

## مردُ وِ ازْلی

قافعہ الموت کے پھانک پر حسین روکا گیا، اور چونکہ اندر داخل ہونے کا اجازت نامہ نہیں پیش کر سکا لہذا وہی خط جو شیخ علی وجودی نے لکھ دیا تھا۔ اس سے لے کے قلعہ دار کے پاس بھیجا گیا۔ پھر زکن الدین خورشاد کے ملاحظہ میں پیش کیا، جو ان دونوں تمام باطنیں کا امام اور علی ذا کرہ اسلام کا پوتا تھا۔ خورشاد کا نور اٹھتا شباب تھا۔ مگر چونکہ ان لوگوں کی عقیدت میں امام پیدا ہوتے ہی امام ہوتا ہے لہذا ان کے قدس وجہا ہت میں نو عمری سے کوئی فرق نہیں ہونے پاتا۔ ان کے نزدیک اگر رتبہ امامت حاصل ہو تو ایک چھ برس کا بچہ اور سانچھ برس کا بوڑھا دونوں یکساں معصوم ہیں اور دونوں کے احکام یکساں طریقے سے وابدھ التعمیل ہیں۔ یہ سلطنت اور یہ مذہب دونوں حسن بن صباح کی بے نظیر کوششوں سے قائم ہوئے تھے جس کو اب ڈیڑھ سو برس گزر چکے تھے۔ اور باوجود یہکہ دنیا میں بڑے بڑے انقلاب ہو گئے مگر اس خاندان کا وہی دور دورہ رہا۔ بعض دلیر اور اوازعزم حملہ آوروں نے دو ایک مرتبہ یہاں سیاسی قوت کو ضرر پہنچایا مگر بعض اثرات پہلے سے زیادہ ترقی پر ہیں اور الموت کا قافعہ اسی طرح مامون و محفوظ چاہ آتا ہے جس پر مخالفت کے ساتھ کوئی پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا۔

مذہبی مقتداً کا تاثر تو یہاں کے تاجداروں کے سر پر ابتداء ہی سے تھا مگر علی ذا کرہ اسلام کے عبد سے یہ لوگ اپنے آپ کو امام اور یادگارِ خاندان بنی فاطمہ بھی کہنے لگے۔ اس لیے کہ ذا کرہ اسلام نے دعویٰ کیا کہ جب میں بچہ تھا تو نزارین مستنصر فاطمی کے پوتے سے مخفی طور پر بدل لیا گیا۔ اس وقت ان لوگوں نے علائیہ امامت کا دعویٰ کر دیا اور اب اپنے آپ کو نو محسن اور الائحت و ناسوت کا

برزخ ظاہر کرتے ہیں۔ جو لوگ بادشاہ یا امام کے احکام بے ندر، بے جلت، آنکھیں بند کر کے، بجا لاتے ہیں اور جن کے خبر سے سارا زمانہ کانپ رہا ہے، فدائی گھلاتے ہیں۔ ان کی یہ حالت بے کہ مقتضد اور فرمائروں کے حکم پر جان دینا اور خود کشی ہی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں۔ انھی فدائیوں کی وجہ سے جو رعب و ادب رُکن الدین خورشاد کے دربار میں ہے، شاید اس عہد کے کسی بادشاہ کے دربار میں نہ نظر آتا ہو گا۔ یہاں کسی کی اتنی بھی مجال نہیں کہ بادشاہ کے سامنے بے ادبی و مخالفت کا خیال بھی دل میں لا سکے۔

شیخ علی وجودی کا خط روکھتے ہی حسین کو باز یابی کی اجازت دی گئی۔ حسین نے سامنے جا کے جیسے ہی فرمائے الْمُوت کی صورت دیکھی، دوڑ کے قدموں پر گر پڑا اور چلانا یا：“ہذا امامی! ہذا امامی!” رُکن الدین اس کے اٹھانے کے لیے جھکنے ہی کو تھا کہ اہل دربار میں سے بعض ممتاز لوگوں نے اسے اٹھا کے لھڑا کیا اور کہا ”بے شک یہی امامِ زمانہ ہیں اور نو محسن ہیں مگر ادب و صبر سے کام لواور جو انجام ہو، پیش کرو۔“

خورشاد: اے نوجوان آہل! تجھے میں کیا بات ہے کہ وادیِ ایمن تیری انتہا سے زیادہ تعریف کرتے ہیں۔ وہ تیرے علم و فضل کے بھی مدا ج ہیں اور تیری بہادری و جاں بازی کے بھی۔

حسین: (ادب سے زمین چوم کر) صرف اسی سبب سے کہ میں نے ان کی خدمت گزاری میں کوئی وقیقہ نہیں اٹھا رکھا، اور کبھی اس بحرِ حقیقت کے حکم سے انحراف کرنے کی جرأت نہیں کی۔

خورشاد: اور اب شیخ نے تجھے کس غرض سے یہاں بھیجا ہے؟

حسین: یا امامِ قائم قیامت! میں فردوس کو ایک نظر دیکھنا چاہتا ہوں۔

خورشاد: (غور کر کے) ابھی تک تو ان معاملاتِ انوارِ لمبیں سے یہی آواز آ رہی ہے کہ سن

ترانی۔

حسین: یا امام قائم قیامت کی توجہ نے شفاعت کی تو ممکن نہیں کہ میری آرزو ہر نہ آئے۔

خورشاد: اے نو الہوں پیکر خا کی! ابھی اس کے متعلق تجھے کسی قسم کی امید نہیں دلائی جاسکتی۔

یہ کہہ کے خورشاد ایک اور شخص کی طرف متوجہ ہونے کو تھا کہ حسین نے آبدیدہ ہو کے اور پُر دردار مایوسی کی آواز میں کہا ”تو اس ادنیٰ جاں شار بار گاہ امامت کو اجازت ملے کہ اس آستانے پر ٹھہر کے اس وقت کا انتظار کرے جب کہ یہ آرزو برآئے گی۔ آئندہ عبید قائم قیامت کے موقع پر وادی ایمن بھی یہاں تشریف لائیں گے اور کیا عجب کہ اس وہن جب کہ قائم قیامت اور امام یک جاہوں گے اور مخلوق کو خالق سے یا پرتو کوئوں سے زیادہ قدر بت ہوگی، میری دعا قبول ہو جائے۔

خورشاد: اچھا، ٹھہر و مگر یہ خیال رب کہ یہاں کے امتحان زیادہ سخت ہیں۔

حسین: میں ہر قسم کے امتحان دینے کو تیار ہوں۔

خورشاد نے اس کے بعد دوسرے شخص کی طرف توجہ کی اور پوچھا ”دیدار کب آئے؟“

دیدار: (باتھ جوڑ کے) آج ہی صحیح کو۔

خورشاد: اور جس کام کے لیے گئے تھے، وہ پورا ہو گیا؟

دیدار: میرا بھر کبھی خالی گیا ہے؟ اگرچہ مہم دشوار تھی مگر جنت کے شوق میں وہاں پہنچا اور امام

کے حکم کو نہایت کامیابی سے پورا کیا۔

خورشاد: ہاں، بیان کرو۔ تم نے چغتائی خان کو کیوں قتل کیا؟

دیدار: یا امام قائم قیامت! ترکستان میں اس جاں شار کا نام منقی تھا۔ وہاں کی مختلف صحبتوں میں

شریک ہو کے فدوی نے ایسی ہر دل عزیزی پیدا کی کہ منقو خان چغتائی خان کے بہادر بیٹے کے

دل میں مجھ سے ملنے کا شوق پیدا ہوا۔ اُس نے مجھے بلوا کے اپنے گھر میں رکھا اور کئی مہینے تک یہی حالت رہی کہ جب تک میں نہ ہوتا کسی بات میں اُس کا دل ہی نہ لگتا۔ اس نے مجھے اپنے باپ سے ملا یا۔ چغتائی خان بھی میری باتوں کا دیوانہ تھا۔ چند روز تک باپ بیٹوں کا میرے سوا کوئی انہیں جلیس نہ تھا۔ چغتائی خان اپنی ذات سے ایسا زبردست اور قومی ہیکل واقع ہوا تھا کہ اس پر حملہ کر کے کامیاب ہونا مجھے نہایت دشوار نظر آیا اور اس وجہ سے مجھے کئی مرتبہ موقع ملنے پر بھی جدائت نہ ہوئی۔ آخر ایک روز رات کو جب پلا کو خان کسی بڑی مہم سے آیا تھا اور منقوخان اس سے ملنے گیا تھا، چغتائی خان مجھے تہائی میں سوتا ہوا مل گیا۔ اس سے زیادہ مناسب موقع ملنے کی امید نہ ہو سکتی تھی۔ میں نے چپکے ہی چپکے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں ایک رشی سے باندھ دیے اور پھر اس پر چڑھ کے اس کا کام تمام کیا۔ اس کے بعد میں واپس چلا آیا۔ مگر مجھے حکم ہوا تھا کہ ان لوگوں کو بتا بھی دوں کہ چغتائی خان قتل کر دیا گیا۔ اس غرض کے لیے ان تمام حالات کو ایک خط میں لکھ کے میں نے پہلے ہی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ اب اسی خط کو لے کے ہلاکو خان کی فرودگاہ کی طرف چلا۔ خوش نصیبی سے چغتائی خان کی پیشی راستے میں مل گئی جو ہلاکو خان سے مل کے اپنے گھر کو آ رہی تھی۔ رات کے اندھیرے میں میں نے وہ خط اُس کے ہاتھ میں چپکے سے رکھ دیا اور بھاگ کے قریب کے جنگل میں چھپ رہا۔ دوسرے دن صبح کو مجھے معلوم ہوا کہ قراقرم ماتم کده بننا ہوا ہے اور ہر شخص کو میری جستجو ہے۔ بعدہ، موقع پا کے میں نے ایک غار میں پناہ لی اور پورے آٹھ دن تک اسی میں چھپا بیٹھا رہا۔ نویں دن جب میدان خالی نظر آیا تو اس غار سے نکل کے اوہر کو روانہ ہوا۔ تین مہینے بعد اب آستان بوئی کو عزت حاصل کر رہا ہوں۔

خورشاد: بے شک، دیدار۔ تم نے بڑا کام کیا اور مستحق ہو کر تمہیں آج ہی جنت کی سیر کرائی

جائے۔

یہ سنتے ہی دیدار خور شاہ کے قدموں میں گر پڑا۔ خور شاہ نے خود اپنے ہاتھ سے اُسے اٹھایا اور ساتھ  
ہی لے جانے کو تھا کہ حسین نے از خود فٹگی کے جوش کے ساتھ کہا ”اے بے رحم بادشاہ! میں سب  
سے زیادہ جنت میں جانے کا آرزو مند ہوں اگر یوں نہیں تو میرا امتحان لیا جائے۔ بتایا جائے کہ  
میں بھی کسی کو قتل کروں۔ آہ! زمرد کے فراق میں صبر نہیں ہو سکتا۔

خور شاہ: ابھی نہ تمہارا امتحان لیا جا سکتا ہے اور نہ تم کو باغ فردوس میں جانے کا کوئی استحقاق ہے۔  
حسین: (جوش و خروش سے) مجھ سے زیادہ مستحق کوئی نہیں۔ میں نے امام نجم الدین غیثا پوری  
کے زندگی کا چراغ گل کیا ہے۔ امام نصر بن احمد کو خون میں ہاتھ رنگ چکا ہوں۔ اب اس کے بعد  
بھی کوئی مجھ سے زیادہ مستحق ہو سکتا ہے؟ میں صرف اپنی بے صبری ہی کی وجہ سے مستحق نہیں بلکہ  
ایک مینوشین حور بھی میرے لیے حیران و پریشان ہے۔

یہ گستاخانہ جملہ سنتے ہی سب چونک پڑے۔ بعض حسین پر حملہ کرنے کو جھپٹے۔ قریب تھا کہ اردوگرو  
کے قوی ہیکل فدائی اس کی بویاں اڑا دیں کہ خور شاہ نے ہاتھ کے اشارے سے سب کو روکا اور  
نہایت ہی متاثر کے ساتھ حسین کا حال دیکھ کے بولا۔ اس گستاخی اور بد تمیزی کی سزا میں تم سے کہا  
جاتا ہے کہ فوراً قلعے سے باہر نکل جاؤ۔ تم اس لائق نہیں کہ فردوس بریں کی پاک زمین تمہارے قدم  
سے ناپاک کی جائے۔ تمہاری سزا قتل تھی۔ چند ایسے اسہاب ہیں جن کی وجہ سے میں تمہارے قتل کو  
مناسب نہیں خیال کرتا۔ مگر اب یہ نہیں ہو سکتا کہ تم اس قلعے میں ایک گھڑی بھر کے لیے بھی ٹھہر نے  
پاو۔“

حسین کو فوراً اپنی گستاخی کا خیال آیا۔ ایک بے اختیاری کی شان سے وہ زمین پر گر پڑا اور عاجزی

کے لبھے میں رو رو کے کہنے لگا ”یا امام قائم قیامت! میری خطا معاف ہو۔ میں جوشِ عشق میں بے اختیار و بے خود ہو گیا تھا“۔ لیکن بالکل شنوائی نہ ہوئی اور خورشاد دیدار کو لیے ہوئے اپنے محل میں چاگیا۔ اس کے جاتے ہی لوگوں نے حسین کو زبردستی دھکے دے کے قلعے سے نکال دیا۔ اس نے ہزار منٹ سماجت کی مگرایک پیش نہ کی گئی۔ بلکہ بعض لوگوں نے کہا کہ تم بڑے خوش نصیب تھے کہ صرف خارقِ البلد کیے جاتے ہو ورنہ یہاں گستاخی کی سزا قتل ہے۔

حسین: پھر اب میں کیا کروں، اور کہاں جاؤں؟

لوگ: ہم نہیں جانتے۔ تمھیں اختیار ہے۔

حسین کی مايوی کی اس وقت کوئی انتہا نہ تھی۔ صرف یہی نہ تھا کہ وہ زمرد کے وصال سے مایوس ہو گیا ہو بلکہ اپنے آپ کو رحمت باری اور نجات سر مردی سے بھی دور سمجھتا تھا۔ اس کے عقیدے میں تھا کہ جب میں اس درگاہ سے مردود ہو گیا تو پھر کہیں ٹھکانا نہیں ملے گا۔ غرضِ الگوتو کے باہر پہاڑوں میں روتا ہوا اور چٹانوں سے سر ٹکراتا تھا۔ دل میں آئی کہ اپنے شیخِ علی وجودی کے پاس جا کے ان سے معافی کی درخواست کرے مگر خیال کیا اس بارگاہِ امامت سے نکالے جانے کے بعد وہ بھی اپنے ہاں پناہ نہ دیں گے۔ خیال ہر طرف لے جاتا اور ہر طرف سے مايوی کے آثار نظر آتے۔ آخر سے زمرد کی نصیحت یاد آئی اور اس کے ساتھ ہی کوہ البرز کی گھانی اور زمرد کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر گئی۔ یہاں کیک آپ ہی کہہ اٹھا تو مجھے وہاں چلنا چاہیے۔ پس اب میرے لیے وہاں کے سوا اور کوئی پناہ کی جگہ نہیں۔“ مگر اس کے ساتھی دل میں خیال گزرا کہ اب تو وہاں بھی مقدوری کی امید نہیں۔ جب اس نورستان اور سر و شبستان سے میرے تعلقات مُطلاقاً قطع کر دیے گئے تو وہ بھی مجھ سے ناخوش ہو گی۔ اور اگر بالفرض خوش بھی ہوا وہ قدیم محبت اس کے دل میں باقی بھی ہو۔

تو یہ کیوں کر ممکن ہو گا کہ امام اور مرشد کے خلاف وہ مجھے کسی قسم کی مدد نہ سکے۔ اب یہ بھی امید نظر نہیں آتی کہ پہلے کی طرح اور وعدے کے مطابق وہ مجھے کامیابی کا کوئی راستہ بتا سکے۔ یہ خیال کر کے وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگا۔ بار بار دل میں آتی تھی کہ انھی پہاڑوں سے نکلا کے خود کشی کرے مگر اس میں اور زیادہ مایوسی کا یقین تھا۔ آخر اس نے دل میں یہی فیصلہ کیا چلو، زمرد ہی کی قبر پر چل کے بیٹھوں۔ اگر دل کی الجھن زیادہ بڑھے گی تو اس حوروش کی قبر کو سینے سے لگاؤں گا

یہ فیصلہ کر کے وہ روتا اور سر دھنٹتا ہوا پہلے قزوین گیا۔ پھر قزوین سے نکل کر کوہ البرز کی اتنی پُرانی گھانٹی پر پہنچا اور وہیں مقیم ہو گیا۔ اتنے انقلاب، اتنی سرگردانی کے بعد اب پھر وہ معشوقہ دلبر کی تُربت کا مجاہر ہے۔ اسی طرح شب و روز عبادت و فاتحہ خوانی میں مصروف رہتا ہے۔ قبر کے پاس بیٹھ بیٹھ کے گھنٹوں زمرد کے خیال سے با تیس کرتا ہے اور بار بار رورو کے کہتا ہے ”امے مینو نشین ناز نین! خدا کے لیے اپنی قبر کی طرف توجہ کر اور دیکھ کر میں کیسا ہیران و پریشان ہوں۔ آہ! تیرے عشق اور تیرے فراق کی بے صبری نے دونوں جہاں سے کھو دیا۔ نہ اس دنیا ہی کے کام کا ربانا اور نہ اس عالم کے کام کا۔ او معشوقہ اور بارگاہِ لم بیز ل کی ناز نین! میرے حال زار پر توجہ کر۔ اس درگاہ میں میری شفاعت کر اور اپنی محبت کا صدقہ، مجھے اپنے وصل سے مایوس نہ رکھ۔“

یہی خیالات تھے جن کو وہ قبر کے سامنے ظاہر کرتا اور یہی دعا تھی جو ہر وقت اس کے لب پر تھی۔ آخر ایک دن اس کی امید برآئی۔ صبح سوریے آنکھ کھول کر دیکھا تو قبر پر زمرد کا خط رکھا ہوا تھا۔ ایک نہیں، بلکہ دو خط، جن میں سے ایک لفاف میں بند تھا اور دوسرا کھلا ہوا۔ حسین نے دونوں خطوں کو انھا کے چو ما اور آنکھوں سے لگایا۔ پھر انھے خط کو پڑھنے لگا، جس میں مضمون حسب ذیل

حسین تو نے بڑی غلطی کی۔ امام قائم قیامت کی خدمت میں اور گستاخی! غنیمت ہے کہ تو بچ گیا۔ افسوس کہ میں اپنے دل کو تیری طرف سے نہیں پھیر سکتی۔ چند روز کے لیے یہاں آ کر تو مجھے اور بے تاب کر گیا۔ اور اسی بے تابی کا نتیجہ ہے جو میں تجھے خط لکھ رہی ہوں۔ افسوس! میں وہ کام کرنے پر آمادہ ہو گئی جو مجھے کرتا نہ چاہیے تھا۔ مگر مجبوری تھی۔ جوابات ہونے والی تھی کیوں کر رکتی۔

خیر، اب تو مستعدی سے میری تدبیر پر کار بند ہو۔ مگر یہ سمجھ لے کہ یہ بہت ہی نازک کام ہے، جسے ضبط و تحمل سے انجام دینا چاہیے۔ اگر تو نے ذرا بھی میرے مشورے کے خلاف عمل کیا تو تجھے ضرر پہنچے گا اور پھر ہم کبھی نہ مل سکیں گے۔ یہ آخری اور سخت تدبیر ہے اور اس کے عمل کے لانے پر میں اس وقت مجبور ہوئی ہوں جب یہ یقین ہو گیا کہ تیرے لیے اب امید اور آرزو کے سب دروازے بند ہو گئے۔ یہ دوسری خط تجھے اس خط جو کے ساتھ ملے گا اور بند ہے، اسی طرح بند رکھ۔ اس کو لے کے مشرق کی طرف روانہ ہو اور سیدھا شہر قراقروم میں جو کاشغر کے قریب ہے، پہنچ۔ وہاں معملوں کی شاہی خاندان میں ایک ملکہ ہے، بلغان خاتون، اس سے تہائی میں ملنے کی کوشش کرو اور میرا یہ خط اُسے دے دے۔ اس امر کی کوشش نہ کر کہ اس میں کیا لکھا ہے اور نہ اس امر کو بلغان خاتون سے پوچھنا۔ وہ تجھ سے جو سوال کرے، بس اس کا صحیح جواب دے دے اور ملکہ بلغان خاتون جس امر کا ارادہ کرے، اس میں اس کی پیروی کر۔ اگر وہ تیرے ساتھ آتا چاہے تو اُسے اور جو لوگ اس کے ساتھ ہوں، ان سب کو میری قبر پر لا کر کے کھڑا کرو۔ بلغان خاتون غالباً تجھ سے اخلاق سے پیش آئے گی اور یقین ہے کہ اپنی قوم کے ایک شکر کے ساتھ ادھر آنے کا ارادہ کرے گی۔ تو خوشی سے اس کی رہبری کرنا اور منتظر رہ کہ پردا غیب سے کیا ظاہر ہوتا ہے۔

حسین یہ خط پڑھتے ہی فوراً قرقرم کی طرف چل کھڑا ہوا۔ راستے میں بار بار اُس کے دل میں آتا تھا کہ مجھے وہاں بھیجنے سے زمرد کی کیا غرض ہے؟ مگر اُس کو وہ خود ہی مٹاتا اور کہتا کہ ان معاملات کے تجھس سے زمرد نے منع کیا ہے، تاہم ایک چیز کی اسے بڑی فکر تھی۔ وہ یہ کہ زمرد نے ملکہ کو سوالوں کا سچ جواب دینے کی ہدایت کی ہے اور میں ایسے کام کر چکا ہوں جن کے ظاہر کرنے میں ہر جگہ جان کا اندر یشہر ہے۔ کیا یہ بتاؤں کہ میں نے امام نجم الدین نیشاپوری کے بے خطاو قصور قتل کیا؟ یا امام نصر بن احمد کی نماز پڑھنے میں جان لی؟ اور سب باقی میں درکنار وہاں تو شاید اگر یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجھے فرقہ باطنیہ سے کوئی تعلق ہے تو وابد القتل قرار دیا جاؤں گا۔ کئی مہینے جو منازل سفر طے کرنے میں صرف ہوئے، انھی خیالات اور اسی قسم کے تردادات میں گزرے۔ آخر وہ چلتے چلتے ترکستان کی حدود میں داخل ہو گیا اور چند روز بعد خاص شہر قرقرم میں وارد ہوا جو تاتاریوں کا پایہ تخت تھا۔ قرقرم میں پہنچ کے بھی کئی مہینے گزر گئے مگر شہزادی بلغان خاتون تک رسائی نہ ہوئی جس کے حسن و جمال کے قصے سارے شہر میں مشہور تھے اور کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کے مارے جانے کے صدمے سے تمام لذائذ دُنیوی سے علیحدہ ہو گئی ہے۔ آبادی سے باہر اس کا ایک باغ تھا جس میں ایک وسیع اور دلچسپ شکار گاہ بنی ہوئی تھی۔ مگر باپ کے غم نے ایسا پھر زمردہ کر دیا تھا کہ اُس نے اب اس باغ میں آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ ایک دن حسین وسط شہر میں کھڑا تھا کہ ناگہاں غل ہوا شہزادی بلغان خاتون آئی ہے۔ وہ سڑک کے کنارے پھر گیا اور زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا تھا کہ ملکہ کئی سہیلیوں کے ساتھ گھوڑے پر سوار آئی اور نکل گئی حسین شاید جرأت کر کے اور جان پر کھیل کے ساتھ میں خط دے دیتا مگر زمرد نے تاکید کی تھی کہ تہائی میں دینا۔ ما یوسی کی

صورت بنائے خاموشی کھڑا رہ گیا اور جب شہزادی نکل گئی تو دل میں کہنے لگا ”یہ تو مشکل نظر آتا ہے کہ اس ناز آفرین ملکہ کی خلوت گاتک رسائی ہو۔“

چند روز اور گزر گئے اب سُنا گیا کہ شہزادی نے مدت کے بعد باٹ اور شکار گاہ میں جانے کا ارادہ کیا ہے۔ حسین کو امید پیدا ہوئی کہ غالباً وہاں موقع عمل جائے گا۔ اسی خیال سے پہلے ہی جا کے شکار گاہ میں پھر پہنچا۔ وہاں بھی ملکہ بالغان خاتون آئی اور چپکے سے ہی چلی گئی۔ حسین کو موقع مانا تھا نہ ملا۔ کئی دفعہ وہ ملکہ سے دوچار ہوا مگر ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی سہیلی ضرور موجود ہوتی تھی۔

جب حسین کو زیادہ مایوسی ہوئی تو آخر تدبیر یہ کی کنو کرمی کا امیدوار بن کے ملکہ کی ڈیورٹھی پر پہنچا اور ملازمت کی درخواست کی۔ اتنے دن قراقرم میں رہ کے اس نے چند روزے دوست بھی پیدا کر لیے تھے جنہوں نے اس کی سفارش کی اور اسے بذکاری ملکہ کو داروغہ اصطبل ہونے کی عزت حاصل ہو گئی۔ اس نوکرمی کے بعد بھی دو مہینے تک اسے تنہائی میں ملنے کا موقع نہ ملا۔ آخر ایک مرتبہ صح سویرے جب کے ملکہ اپنے بستر ناز سے اٹھ کر غسل خانے میں جا رہی تھی اور بالکل اکیلی تھی، وہ سامنے آ گیا اور جھک کر سلام کیا۔ بالغان خاتون حسین کو غیر معمولی طور پر شدراہ دیکھ کے بھرگئی اور پوچھا ”کیوں؟ کیا بات ہے؟“

حسین: (زمین چوم کے) شہزادی کی خدمت میں ایک خط پہنچانا ہے، جس کو لیے ہوئے چھ مہینے سے قراقرم میں پھر رہا ہوں اور صرف اس وجہ سے کہ بغیر تنہائی کے مجھے اس خط کے پیش کرنے کی اجازت نہ تھی، اتنی تائیر ہوئی۔ اسی غرض کے لیے مجبوراً میں نے شہزادی کی ملازمت اختیار کر لی۔ بڑی بڑی نامرادیوں کے بعد خوش نصیبی سے اس خط کے پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے زمر دکا خط نکال کر شہزادی کی طرف بڑھایا۔

شہزادی بلغان خاتون تاتاری عورتوں میں ہی نہیں، تا تاری رو سا کے بھی خلاف ایک نہایت ہی شایستہ اور تعلیم یا فتنہ ملکہ تھی۔ وہ فارسی زبان میں بے تکلف گفتگو کرتی تھی۔ اس قدر نہیں بلکہ شعرائے فارس کے کلام کی اچھی طرح دادے سکتی تھی، اور مشکل اور بلیغ فارسی کو یوجہ احسن سمجھ لیتی تھی۔ خط کو با تھر میں لیتے ہی اس نے غور سے دیکھا، پھر لفافے کو سادہ پا کے ٹھجب سے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا ”یہ خط کس نے بھیجا ہے؟“

حسین: شہزادی کو پڑھنے کے بعد خود ہی معلوم ہو جائے گا۔ مجھے صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ یہ خط کسی انسان کا نہیں بلکہ ایک حور کی طرف سے ہے جس کا نیشن اس سرو شہستان اعلیٰ اور حیز نور میں ہے۔

بلغان خاتون نے یہ جواب سُن کے اور حیرت زدہ ہو کے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا ”اگر فردوسِ بریں کی کسی حور کا خط ہے تو تم کو کیوں کرملا؟ اور تم سے اس کا کیا تعلق؟“

حسین: بس اتنا ہی تعلق ہے کہ اس کی یاد میں سر دھننا ہوں اور کبھی کبھی وہ کوئی خط کسی روحاںی ذریعے سے میرے پاس پہنچا دیتی ہے۔

تاتاری شہزادی یہ جواب سُن کے اور متغیر ہوئی اور دریہ تک حسین کو غور سے دیکھتی رہی۔ پھر دل میں سوچ کر بولی ”اچھا، اب اس وقت تم جاؤ۔ اس خط کو اطمینان سے پڑھ کر میں تم کو بادوں گی۔“

حسین: (سینے پر ادب سے با تھر کھ کے) بہتر مگر اتنا خیال رہے کہ اس بارے میں جو کچھ دریافت فرمانا ہو، شہزادی اسی طرح تہائی میں بُلا کے دریافت فرمائیں۔ میں اپنے راز کو کسی اور کے سامنے صحیح طور پر بیان نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون: میں اکیلی ہی لاوں گی۔

یہ خط اور حسین کا بیان معمولی چیزیں نہ تھیں۔ شہزادی بالغان خاتون نہان بھی بھول گئی اور حسین کے واپس جاتے ہی پھر اپنی خواب گاہ کی طرف پہنچ گئی۔ تنہا بیٹھ کے خط کو کھوا اور نہایت توجہ اور مستعدی سے پڑھنے لگی۔

### مضمون حسب ذیل تھا:

”اوغزر دہ اور نیک دل شہزادی! تو اپنے باپ کے غم میں بتتا ہے جو باطنیں کے فدائی دیدار کے ہاتھوں سے نہایت دغا بازی کے ساتھ قتل ہوا۔ مجھے تیرے رنج والم سے ہمدردی ہے۔ اسی لیے اپنے منصب کے خلاف تجھے خبر دیتی ہوں کہ دیدار یہاں قلعہ الگوت میں بیٹھا جنت کے مزے لوٹ رہا ہے۔ اگر اپنے باپ کا انتقام لینا چاہتی ہے، اگر دنیا کے پردے سے ایک بہت بڑا فتنہ دور کرنا چاہتی ہے تو اسی حسین کے ساتھ ہو میرا خط لا یا ہے اور جو جنت کی زیارت کے شوق میں عقل و ہوش بلکہ دین و ایمان کھو چکا ہے، کوہ ابزر کی وادی میں میری تحریکت پر آ کے پھر کو اٹ۔ اس کے نیچے تو میرا دوسرا خط پائے گی جو تیری رہبری کرے گا اور تو اپنے باپ کے انتقام کے ساتھ ایک بڑے طسم کو توڑ کے دنیا کا سب سے بڑا راز کھولے گی۔ اُس وقت تجھے معلوم ہو جائے گا کہ دنیا اور ملائِ اعلیٰ میں کتنا فرق ہے۔ حسین سے تو اس کے حالات پوچھ سکتی ہے جس سے تجھے معلوم ہو گا کہ اس کے دل پر فردوسِ بریں کا کتنا اثر ہے۔ جہاں میں ہوں یہی جنت میں تجھے بے مثت دکھاؤں گی اور تیرا مجرم تیرے ساتھ میں ہو گا۔ لہذا آ اور جلدی آ۔ مگر خیال رہے کہ ۲۷ رمضان کی صبح کو میری تحریکت پر موجود ہو۔ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کافی تعداد میں ایک تاتاری لشکر تیرے قریب ہی موجود رہے لیکن میری قبر پر تجھے اپنے ساتھ میں چار آدمیوں سے زیادہ کوئہ لانا چاہیے۔ مینو نشیں زمرد۔“

باغان خاتون کے حق میں یہ خط کسی جادو یا تسلیم کے حکم سے کم اثر نہ رکھتا تھا، جس کو پڑھتے پڑھتے کبھی وہ انتہا سے زیادہ غصب ناک ہو جاتی اور کبھی خاص خیال سے اس کے دل کو یک گونہ تسکین ہو جاتی۔ مگر حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہ تھی۔ اس نے خط کو اول سے آخر تک کئی مرتبہ پڑھا اور کچھ سوچنے لگی۔ آخر بہت دیر کے لیے تردد و انشتا کے بعد اس نے حسین کو اپنے سامنے بلایا اور پوچھنے لگی ”تم جانتے ہو اس خط میں کیا لکھا ہے؟“؟

حسین: نہیں۔ مجھے ایک لفظ کی بھی خبر نہیں۔

یہ جواب پاکر باغان خاتون نے تجسس کی نگاہ سے حسین کو گھور کے دیکھا اور پوچھا ”تم مذاہب باطنیہ کے پابند ہو؟“؟

حسین: (ڈر کے) جی با۔

باغان خاتون: تم نے جنت کی سیر کی ہے؟

حسین: ایک بار دیکھا ہے اور دوبارہ دیکھنے کی ہوں ہے۔

باغان خاتون: اچھا، تمہاری یہ ہوں پوری ہو جائے گی، مگر یہ بتاؤ، تمہارے شمارفدا ٹیوں میں ہے؟

حسین: البتہ۔

یہ جوب سُ کر باغان خاتون پھر حسین کو گھور کے دیکھا اور پوچھا ”تم نے کتنے لوگوں کی جان لی ہے؟“؟

حسین: صرف دو شخصوں کی۔ مگر بڑے بڑے شخص، جن کے قتل کرنے کا مجھے بھی افسوس ہے۔

باغان خاتون: ان پر خبر چاتے وقت تمہیں ترس نہ آیا؟

حسین: آیا تھا مگر مرشد کے حکم سے انحراف نہیں کر سکتا تھا۔

بلغان خاتون: (تعجب سے) مُرِشد کے حکم سے اتنے بڑے ارتکاب کر لینے میں تمھیں اپنے نیک و بد کا خیال نہیں آیا؟

حسین: نیک و بد ہمیں نظر ہی کب آتا ہے۔ ہم ہر چیز کے ظاہر کو دیکھتے ہیں اور شیخ کی نگاہیں باطن پر، یا یوں کہنا چاہیے کہ اصلی حقیقت پر پڑتی ہیں۔

بلغان خاتون: اگر مُرِشد گرنے کو کہے تو گر پڑو گے؟

حسین: باتا مُثُل! یہی ہمارا عقیدہ اور پہلی ریاضت ہے۔ مُرِشد جس خوبی کو دیکھ کے حکم دیتا ہے، اُس کے سامنے اس بُرائی یا مضرت کی کوئی ہستی ہی نہیں۔

بلغان خاتون: زمرد کی تم سے کیوں کرمُفارقت ہوئی؟

حسین: میں منع کرتا رہا، اُس نے نہ مانا اور کوہ الہر ز کی اس لھائی میں چلی گئی جہاں کبھی کبھی پر یوں کا گزر ہوتا ہے۔ ہمارے جاتے ہی پریاں بھی آپنچیں۔ انہوں نے آتے ہی اُسے مار ڈالا اور اُس کی وہاں قبر بنا دی جس پر مدد توں میں آہ وزاری کرتا رہا۔ شہادت نے زمرد کو فردوس بریں میں پہنچا دیا اور میں قبر پر پڑاموت کا منتظر تھا کہ زمرد نے فردوس بریں سے خط بھیج کے مجھے فرقہ نا جیہہ باطنیہ میں داخل ہونے کی ہدایت کی اور اپنے پاس پہنچنے کا طریقہ بتایا، اُس کی ہدایتوں کے مطابق عمل کر کے میں ایک بار اُس کے دیدار سے شرف یا ب ہو چکا ہوں۔ مگر افسوس پھر ملنے کی امید نہیں۔ اب دوبارہ کوشش اس کی زیارت کے لیے آپ کے ذریعے سے شروع ہوئی ہے مگر چونکہ مجھے کچھ پوچھنے کی اجازت نہیں۔ لہذا آپ کے سامنے میں اپنی کوئی آرزو پیش نہیں کر سکتا۔

بلغان خاتون کو حسین کی اس سادہ مزاجی پر حیرت ہوئی۔ وہ کسی قدر مسکرائی اور کہا:

”بے شک میں اپنی آرزو میں با مراد ہوں گی اور تمہاری تمثا برا آئے گی۔ لیکن مجھے بھی اس مقام

تک پہنچا و جہاں زمُر دکی قبر بے اور جس جگہ تم کہتے ہو کہ وہاں پر یوں کانشمن ہے۔

حسین: اس امر کا تو مجھے حکم ہو چکا ہے۔ شہزادی جب تشریف لیں چلیں، یہ غلام ہمار کاب ہو گا۔

بلغان خاتون: حسین اگر میں کسی کو قتل کرنے کا ہوں تو تم اسے قتل کر ڈالو گے؟

حسین: بے شک، بشرطیکہ اسے قتل کرنے میں کچھ مضائقہ نہ ہو۔

بلغان خاتون: یہ قید تم مرشد سے بھی لگاتے ہو؟

حسین: نہیں۔ مرشد کے تعلقات مُرید کے ساتھ اور قسم کے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں مُرید کو ایک بے جان آئے کی طرح رہنا چاہیے۔

بلغان خاتون: خیر اب تو میں سفر کا سامان کرتی ہوں۔ تم بھی تیار رہو۔

یہ کہہ کے شہزادی نے حسین کو رخصت کیا اور خود حمام میں گئی۔ مگر اس کی حیرت کسی طرح کم ہونے کو نہ آتی تھی۔ لوگ اس کے مزان میں کوئی غیر معمولی تغیر پاتے تھے جس کے متعلق ہر شخص سوال کرتا مگر وہ خاموش رہتا۔

دوسرے دن اس نے علی الصباح ایک ساٹھی سوار کو خط دیکر کسی طرف روانہ کیا اور خود بھی روانی کا سامان کرنے لگی۔ مگر اس کے لیے یہ ضروری تھا کہ اپنے اس عزم اور شہنشاہِ پرکستان منقوغان سے اجازت حاصل کرے جس کے لیے وہ ایک تردد میں تھی۔

## بلغان خاتون کا سفر

جس روز حسین نے اپنی مینوں شیں معموقہ زمر دکا خط بلغان خاتون کو پہنچایا ہے، اس کے ایک ہفتے کے بعد صبح کے وقت تاتاری شہزادی اپنے بھائی منقوخان کے پاس گئی۔ منقوخان کے دربار میں اُس وقت خاندان تاتاری کے کئی معزز زردار ساموں جو دتھے جن کے سامنے وہ کہتے ہوئے جھجکلی اور دیر تک خاموش بیٹھی رہی۔ اُس کو پچپ دیکھ کے منقوخان نے کہا ”یہ غیر معمولی سکوت کیسا؟“ ایک درباری: شہزادی اپنے والد کے غم کو آج تک نہیں بھولیں۔

منقوخان: ہاں، بلغان! اب تو اس غم کو چھوڑ دو۔ اتنے دنوں تک غم والم میں بنتا رہنا ہماری قومی شجاعت کے خلاف ہے۔

بلغان خاتون: آہ بھائی! یہ غم بھول سکتا ہے؟ (تحوڑے سکوت کے بعد) خیر۔ اب با تیس تو ہوتی رہیں گی، اس وقت میں ایک ضروری کام کو آئی ہوں۔

منقوخان: وہ کیا؟

بلغان خاتون: بھائی! آپ نے تو بہت سی مہمیں سر کیمیں مگر اب ارادہ ہے کی ایک مہم کو میں خاص اہتمام کے ساتھ اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

اس ٹھملے کو سنتے ہی سب لوگ حیرت میں آگئے۔ منقوخان نے اُسے گھور کے دیکھا اور پوچھا ”بہن! خیر تو ہے؟ کیسی مہم؟ کیا میرے اسلحے نے جواب دے دیا ہے؟ فقط تمہارے کہہ دینے کی ضرورت ہے۔ جس ملک یا جس قوم کو کہو، میرے جانے کی بھی ضرورت نہیں، ہمارے بہادر سپاہی جائیں گے اور ایک آن میں تہ و بالا کر دیں گے۔“

بلغان خاتون: یہ صحیح ہے، مگر میں چاہتی ہوں کہ اس کام کو خاص اپنے ہاتھ سے انجام دوں۔

منقوخان: آخر کون سا کام ہے، اور کس پر فون کشی کا ارادہ ہے؟

اسکے جواب میں بلغان خاتون نے زمر دکا خط اُسکے سامنے رکھ دیا اور کہا ”پہلے اسے پڑھ لیجیے، پھر پوچھیے گا۔“ منقوخان نے خط کو اول سے آخر تک پڑھا لیکن ختم کرنے سے پہلے ہی اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔ اس نے غصب آلو ڈھشم اور زخم شدہ ہونٹوں سے خط کو تمام کر کے غصے سے بچنیک دیا اور کہا ”مطمئن رہو۔ میں کل ہی یادو خان کو لکھتا ہوں۔“

بلغان خاتون: نہیں۔ یہ میرا کام ہے۔

منقوخان: تم جا کے کیا کرو گی! جنگ و پریکار ٹھہرا کام نہیں۔

بلغان خاتون: اسی خیال کو میں دنیا سے مٹا کے ثابت کرنا چاہتی ہوں کہ عورتیں بھی ویسی ہی بہادر ہیں جیسے مرد۔ اگر موقع دیا جائے تو کسی امر میں مردوں سے کم نہیں رہیں گی۔ اور ابھی تو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہاں لڑنے کی ضرورت ہو گی یا نہیں۔

منقوخان: بے شک ہو گی۔ بغیر اس کے کامیابی ممکن نہیں۔ باقی رہی عورتوں کی شجاعت، میں تسلیم کرتا ہوں کہ عورتوں کی حکومت مردوں سے بڑی ہوتی ہے۔ بڑے بڑے تاجدار اور بڑے بڑے صفتیں جو عالم کے تحت اُنکے دیتے اور ساری دنیا کے بہادروں کے دست و بازو تھکا دیتے ہیں، ان پر بھی جو حکومت کرتا ہے، وہ عورت ہے۔ مگر عورت کے اسلحے دوسرے ہیں۔ وہ تیر اور خندگ، شمشیر و نجڑ سے نہیں اُرثتی بلکہ اپنے حریقوں پر تیر

بلغان خاتون نے اس جواب پر شرمende ہو کے سر جھکا لیا۔ مگر یقینی نظرود میں اس نے پھر متاثر پیدا کی اور کہا ”بھائی! ایسا نہ سمجھیں۔ میں اسی طرح بہادری اور جان بازی سے مقابلہ کروں گی جس

طرح کسی بہاؤ رتا تاری لڑکی کو کرنا چاہیے۔

منقوخان: یہ میں جانتا ہوں مگر جس وقت تک ہم لوگ زندہ موجود ہیں تم سی ناز نہیں کو میدان جنگ میں قدم رکھنے کی زحمت نہیں دی جاسکتی۔ اور آختم ہمارے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟

بلغان خاتون: یہ صرف میرا کام ہے اور اپنے فرض سے میں آپ ہی سبک دوش ہونا چاہتی ہوں۔

منقوخان: خیر ایسا ہی شوق ہے تو چلو۔ مگر میں بھی ساتھ چلوں گا۔ یہ مجھ سے گوارا نہیں ہو سکتا کہ خاندانِ مغلیہ کی ایک معزز شہزادی اپنے نامور عزیزوں کے ہوتے ہوئے تین تنہا میدان کار زار میں قدم رکھے۔

بلغان خاتون: مگر بھائی! وہاں کسی لڑائی کی امید نہیں۔ ہمارے چند سپاہی بھی ہوں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔

منقوخان: یہ نہ بھھو۔ جو لوگ سردار کے ایک ادنیٰ اشارے پر جان دینے کو تیار ہو جائیں، ان سے ڈرانا چاہیے۔

بلغان خاتون: مگر تاریوں کا رجوب آن کل دلوں پر اس قدر بیٹھا ہوا ہے کہ میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ وہ لوگ بے لڑے ہتھیار رکھ دیں گے۔

منقوخان: بے شک ہمارا ایسا ہی رجوب ہے۔ مگر پھر بھی ایک قدیم اور ڈیرہ ہوسبرس کے شاہی و مذہبی خاندان کو جزا سے اکھاڑ کر پھینک دینا آسان کام نہیں۔

منقوخان دیر تک اصرار کرتا رہا۔ جب شہزادی بلغان خاتون نے اس کی شرکت کسی طرح گوارانہ کی اور دیکھا کہ بھائی منظور نہیں کرتا تو جھک کے اس کے کان میں کچھ کہا جسے سُن کے وہ تھوڑی دیر تک غور کرتا رہا اور آخربڑی دیر کی بحث و تکرار کے بعد یہ قرار پایا کہ اولو العزم و بہاؤ رتا تاری شہزادی

پانچ سو سوار ساتھ لے کے روانہ ہو جائے۔ بلغان خاتون واپسی کے لیے اٹھتے بیٹھ گئی اور خط کو دو باہ بھائی کے سامنے پیش کر کے بولی:

”مگر ذرا ویکھ کے یہ بھی بتا دیجیے کہ مجھے کب یہاں سے روانہ ہونا چاہیے؟ زمرد نے کس تاریخ کو بُلا یا ہے؟“

منقوخان: (خط کو پڑھ کے) رمضان کی ۲۷ تاریخ۔

بلغان خاتون: خدا جانے اس تاریخ کے معین کرنے سے کیا غرض ہے۔ تو پھر مجھے گوچ کر دینا چاہیے۔

منقوخان: اس میں کوئی بات ضرور ہے اور میری سمجھ میں تو یہ بھی نہیں آتا کہ اس گھاتی میں پہنچنے کے بعد تمھیں کیا پیش آئے۔ ممکن ہے کہ اس عورت نے جو اپنے کو حور بتاتی ہے، فریب کیا ہو؟

بلغان خاتون: اس کی تحریر اور اس کی بے تکلفانہ دعوت سے مجھے فریب کی امید نہیں۔ باوجود اس کے محض اسی خیال سے میں نے تھوڑے سے سپاہی ساتھ لے جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ اور آپ تو جانتے ہیں کہ اپنی حفاظت کا میں نے پورا بندوبست کر لیا ہے۔ ہاں، تو زمرد نے رمضان کی ۲۷ کو بُلا یا ہے اور آن کوں تاریخ ہے؟

منقوخان: جمادی الاول کی ۲۰۔ قریب قرب چار مہینے سے کم کا نہیں۔ اگر جلدی پہنچ گئیں تو راستے میں کسی جگہ ٹھہر جانا مگر جانا ہے تو کل ہی گوچ کر دینا چاہیے۔

اس کے بعد منقوخان کچھ آپ ہی سوق کر بوا ”ہاں خوب یاد آیا۔ بلغان خاتون، ایک دو دن اور ٹھہر جاؤ۔ آن سے چوتھے دن ہلا کو خان کی کمک کوچا لیں ہزار سپاہیوں کا بڑا بھاری لشکر جانے والا ہے جس کو طوبی خان لے جائے گا۔ اس کے ساتھ تم بھی ہو لینا۔ یہ لوگ بھی اس طرف جائیں

گے جدھر تم جاتی ہو۔ بلکہ انھیں تم سے آگے جانا ہے۔ ہلاکو خان دیلم کے تخت پر قبضہ کر چکا ہے۔ فی الحال اس کا تعاقب کر رہا ہے۔ اس فون کے پہنچنے کے بعد وہ ارض عراق کا عزم کرے گا، اور ارادہ ہے کہ خلیفہ بغداد کو بھی اس کی سرتاہیوں اور غور کی سزا دی جائے۔

بلغان خاتون: ایک دن کی بات ہے تو میں ٹھہر جاؤں گی۔

ان تمام امور کا تصفیہ کر کے بلغان خاتون اپنے مکان پر واپس آئی اور حسین کو بُلا کے کہہ دیا۔ ”پرسوں ٹوپ ہے۔ تیار ہنا۔“ حسین نے سینے پر ہاتھ رکھ کے اور ادب سے صریح کا کے جواب دیا ”مجھے تو جس وقت حکم ہو، حاضر ہوں۔“

دوسرے روز منقو خان کا بیٹا طوبی خان بھی کوچ کا سامان کرنے لگا اور اس کے ساتھ کے لیے چالیس ہزار جوانوں کو تیاری کا حکم دیا گیا۔ آخری رات سپاہ نے عجیب ذوق و شوق اور بڑی دھوم دھام میں بسر کی۔ قراقرم کے درود یوار سے جوش و خروش نمایاں تھا۔ ہر طرف ایک چہل پہل تھی۔ لوگ ادھر ادھر دوڑے پھرتے تھے۔ جو اپنے گھروں اور نیمیوں میں تھے، وہ خوشی خوشی اسلی بھی درست کرتے جاتے تھے اور عزیزوں، بیوی بچوں سے بھی رخصت ہوتے جاتے تھے۔ صح سویرے ہی کوچ کا طبل بجا اور تاتاریوں کے غول اپنے اپنے نشانوں اور بیروں کے نیچے جوش مسٹرست میں کوڈتے۔ اپنے قومی گیتوں کو گاتے اور شور کرتے ہوئے بڑا ہے۔

یہ فون مختلف حصوں میں تقسیم ہو کے روانہ ہوتی۔ ہر اول کے پانچ ہزار جوان آگے بڑا ہے گئے۔ پھر جاں نثاروں کی پانچ پانچ ہزار لکڑیاں داہنے باہنے میں پھیل گئیں۔ پانچ ہزار کا ایک گروہ پیچھے غول میں رہا اور درمیان یا قلب میں پورے ۲۰ ہزار ترک جدا جد افوجوں اور پرچموں میں بٹے ہوئے آگے پیچھے روانہ ہوئے، جن کے نیچے میں طوبی خان اور بلغان خاتون دو مضبوط گٹھے ہوئے ترکی گھوڑوں

پر سوار تھے۔ تاتاری کمانیں اور نیزے کے چاروں طرف حلقة کیے ہوئے تھے اور ہر چہار طرف سے جوش والے کی صدائیں اور فتح و نصرت کے نعرے باندھو رہے تھے۔ تاتاریوں کا یہ طوفان ایک بڑی دل کی طرح راستے کی تمام چیزوں کو خراب کرتا چاہتا تھا جو گاؤں نظر آتا، آدمیوں سے خالی ملتا۔ اس لیے کہ ان بے رحم و جرمی لشیروں کی آمد کی خبر سننے ہی لوگ اپنے گھر چھوڑ کے بھاگ جاتے اور ان کے ویران اور غیر آباد مکانوں میں آگ لگادی جاتی۔ یہ لوگ جوں جوں آگے بڑھتے، شہر اور گاؤں مسمار و منہدم اور جل جل کر خاک سیاہ ہوتے جاتے۔ رعایا میں سے مرد، عورت، بولڑھا، بچہ جو شخص ملتا، انسان کا شکار کھینے والے وحشیوں کے ہاتھ سے قتل ہوتا۔ یہ لوگ تمام علاقوں میں خلقِ خدا کو بتاہ کرتے ہوئے بھر خزر کے کنارے کنارے چلے اور مازندران میں پہنچے۔ پھر ان کے گاؤں تاخت و تاران کر کے آذربائیجان کی طرف نکل گئے۔ اس لیے کہ ہلاکو خان کے اسی طرف ہونے کی خبر تھی کیونکہ وہ سلطانِ پیغم کے تعاقب میں شمال کی طرف بڑھ گیا تھا۔

مگر بالآخر خاتون اپنے ساتھ کے پانچ سوسواروں کے ساتھ جبل طالقان کے دامن میں فہر ویر نجان کے قریب خیمنہ زن ہو گئی (عین اسی مقام پر جہاں اس ناول کی ابتداء میں ہم نے زمر داور، حسین کو پایا تھا۔)

جس وقت یہ پانچ سوتا تاتاری اُس سرز میں پر پہنچے ہیں، رمضان کی ۱۸ تاریخ تھی۔ مجبوراً چند روز اسی جگہ فروکش رہنا پڑا، جس سے زیادہ کوئی مصیبت تاتاری لشکر کے لیے نہیں ہو سکتی تھی۔ ان لوگوں کا معمول تھا کہ جب تک لوٹتے مارتے رہتے، اسی وقت تک اچھے اور خوشحال رہتے اور جہاں کسی جگہ قیام ہو گیا، محض اس وجہ سے کئے شہر اور قبے ان کو نہ ملتے، فاتح کرنے لگتے۔ یہاں بھی یہی

مجبوری تھی۔ سب نے انتظار کر کے دن فقر و فاق سے بسر کیے۔ نویں دن ٹھیک ۲۷ تاریخ تھی۔  
بلگان خاتون صحیح ہی سے کسی انتظار میں تھی اور جوں جوں دیر ہوتی، اس کی پریشانی بڑھتی جاتی تھی۔  
آخر جب اس نے دیکھا کہ وقت لگا جاتا ہے تو پس و پیش کے بعد تین فوجی جوانوں کو ساتھ لے  
کے چل کھڑی ہوئی۔ حسین اس کا رہبر ہوا۔ باقی تمام ہمراہی وہیں چھوڑ دیے گئے۔ حسین اور  
تاتاری شہزادی سرک چھوڑ کے نہر و رینجان کے کنارے کنارے چلے اور بدقت و دشواری گھائیوں  
اور جنگلوں سے گور کے اس مرغزار میں جا پہنچے۔ حسین نے زمرد کی قبر پر جا کے فاتح خوانی کی اور  
کہا ”یہی پھر ہیں جن کے نیچے میری زمرد کا پیکر عنصری آرام کر رہا ہے۔“

بلگان خاتون نے زمرد کا خط نکال کر پھر پڑھا اور زمرد کی ہدایت کے موافق قبر کے پھروں کو خود  
اپنے ہاتھوں سے ہٹانے لگی۔ چار پانچ پھر ہی ہٹے ہوں گے کہ حسب و عدہ زمرد کا دوسرا خط مل گیا  
جسے کھول کے اس نے چکے چکے پڑھا اور ذرا امتر ڈدھو کے سامنے کی طرف نظر پڑھا پڑھا کے دیکھنے  
لگی۔ چند لمحوں کے بعد کچھ سوچا اور اپنے ایک ہمراہی کے کان میں کچھ کہنے کو بھی۔ تاتاری سپاہی  
شہزادی کا راز سُننے ہی واپس روانہ ہوا اور وہ خود حسین کی طرف دیکھ کے بولی ”چلو۔“

حسین: کہاں؟

بلگان خاتون: جہاں میں لے چلوں۔

اتنا کہتے ہی دونوں باقی ماندہ سپاہیوں کو ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور چل کھڑی ہوئی۔ حسین کی کیا  
مجاہ انکار تھی۔ بے عندر ساتھ ہو لیا۔

بلگان خاتون اس وادی کے شمالي کونے کی طرف چلی۔ اسی طرف جدھر سے حسین نے کبھی پریوں کو  
آتے دیکھا تھا۔ جاتے جاتے تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ ایک سر بز پہاڑ کے دامن میں پہنچی اور گو-

اُس طرف کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا مگر وہ برابر بڑھتی چلی جاتی تھی۔ حسین تو ایک عقیدت کیش  
مُرید کی شان سے بے عذر اطاعت کر رہا تھا مگر ہمارا ہی سپاہیوں کو حیرت تھی کہ شہزادی انھیں کہاں  
لیے جا رہی ہے۔ بلکہ ایک نے بڑھ کے ادب سے پوچھا بھی کہ ادھر تو راستہ نہیں ہے۔ جس کے  
جواب میں باغان خاتون نے کہا کہ تم کچھ بولاو چا لو نہیں۔ خاموشی سے چلے آؤ۔ پہاڑ کی جنگ میں  
پہنچ کے وہ ایک تیرہ دو تار غار میں گھس گئی اور ساتھیوں سے کہا۔ اس طرح چلو کہ کسی کو آہٹ معلوم نہ  
ہو۔ شہزادی کے حکم کے مطابق سب لوگ جہاں تک ممکن تھا، آہٹہ آہٹہ قدم اٹھاتے چلے۔ غار  
کے اندر بالکل اندر ہیرا تھا۔ سب ہاتھوں سے ٹوٹتے اور دونوں طرف کے ٹکروں سے بچتے جاتے  
تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد دور کچھ روشنی نظر آئی جس کی نسبت معلوم ہوا کہ غار کے اس طرف کا  
دہانہ ہے۔ آخر باغان خاتون اس غار سے باہر نکلی۔ مگر جب غار سے نکل کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ  
مقام بھی وحشت ناک ہے اس لیے کہ یہاں بہت ہی گھنا جنگل تھا جس کے درخت اس طرح ملے  
ہوئے تھے کہ آفتاب کی روشنی بے مشکل زمین تک پہنچ سکتی تھی۔

شہزادی اس جنگل میں پہنچتے ہی بائیں ہاتھ کی طرف مُرگئی۔ اب اس کا زخم مغرب کی طرف تھا۔ وہ  
درختوں میں پھنستی اور کاثتوں میں الجھتی برابر آگے چلی جاتی تھی۔ ساتھ دوالے اس دشوار گزار  
راستے کو دیکھ کے گھبرا گئے تھے اور دل میں حیران تھے۔ آخر یہ جنگل یک ایک پہاڑ کے پاس ختم  
ہو گیا۔ یہاں پہنچ کے شہزادی پھر داہنے ہاتھ کی طرف مڑی اور پہاڑ کے دامن ہی دامن میں دور  
تک چلی گئی۔ ایک مقام پر پہنچ کے اسے نظر آیا کہ جیسے کسی ناگہانی صدمے کے باعث پہاڑ پھٹ  
گیا ہے اور درمیان میں ایک بہت ہی تنگ اور لمبی گلی پیدا ہو گئی ہے جس سے ایک سے زیادہ آ  
دمیوں کا گزر نہیں ہو سکتا۔

بلغان خاتون نے اس گلی کو غور سے دیکھا، چاروں طرف نظر دوڑائی اور جیسے دل ہی دل میں کچھ مطمئن ہو کے اس گلی کے اندر گھسی۔ اندر جانے سے پہلے اس نے ایک اور ہمراہی سپاہی کے کان کی طرف جھک کے کچھ کہا جس کے ساتھ ہی وہ واپس چاگیا۔ اب شہزادی حسین اور باقی ماندہ ایک جوان کو ساتھ لے کے گلی میں داخل ہوتی۔ گلی کے اندر ایک مقام پر ایک کھڑکی ملی جسے شہزادی نے کھول کے دیکھا تو کپڑوں کا ایک زنانہ جوڑا تھا اور دو مردانے جوڑے جو باکل دھقانوں اور گائے بھیں سپالنے والوں کی وضع کے تھے۔ شہزادی نے دونوں جوڑے حسین اور دوسرے ساتھی کو دے کے کہا۔ ”اپنے کپڑے اتار کے یہاں رکھ دو اور یہ کپڑے پہن او۔“ یہ کہہ کر وہ خود بھی زنانہ جوڑا پہننے لگی۔ جب سب کپڑے پہن چکے تو گویہاں اندھیرا تھا، حسین شہزادی کی وضع ولباس کو حیرت سے دیکھنے لگا۔

بلغان خاتون: کیوں حسین! ٹھب کس بات کا ہے؟

حسین: کیا عرض کروں۔ یہ لباس پہن کے تو آپ دنیاوی شہزادی نہیں آسمانی گور معلوم ہوتی ہیں۔

بلغان خاتون یہ بات سن کے مسکرائی اور بولی ”بس چکے چکے چلے آؤ۔“ اور آگے روانہ ہوئی۔ یکاں کیا معلوم ہوا کہ آڑی چٹان نے راستہ بند کر دیا ہے۔ بلغان خاتون نے جب مڑکے دیکھا تو نیچے ایک چھوٹا سا سوراخ نظر آیا جس میں سے ایک آدمی مشکل سے سمت سمت کے نکل سکتا ہے۔ وہ اسی سوراخ سے نکلی اور ہمراہیوں کو بھی نکلنے کا حکم دیا۔ اس دشواری کو جھیل کے شہزادی آگے بڑھی، لیکن بظاہر ایک بہت بڑی مشکل نظر آئی۔ وہ یہ کہ آگے ایک زبردست فوادی دروازہ تھا جو دوسری طرف سے بند تھا۔ مگر بلغان خاتون نے دروازے کے داہنے بازو کے برابر سے ایک

پتھر نکالا، جس کے لئے ہی روشن دان میں ہاتھ ڈال کے اُس نے دروازے کی کنڈی کھولی۔ جواندر سے بند تھی۔ اس کے بعد تاری سپاہی اور حسین کی زور آوری سے فولادی پٹ اندر کی طرف ہٹ آیا اور جانے کا راستہ بن گیا۔

اس دروزے سے لگتے ہی باغان خاتون نے حیرت سے دیکھا کہ عجب فرحت بخش روح افزایش لگے ہوئے ہیں۔ پھولوں کی بہار اور طیور کی نغمہ سنجیاں دیکھتے ہی بے ساختہ اس کی زبان سے نکل گیا ”واہ!“ مگر حسین جو اس مقام کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے حیرت سے دیکھ رہا تھا، شہزادی کی زبان سے یہ لفظ سُن کے بولا ”محھ تو یہ فردوسِ بریں معلوم ہوتا ہے۔ مگر کیوں کر ہوں؟“

باغان خاتون: اب میں تمھیں چور نظر آتی ہوں تو ضرور ہے کہ یہ باش جنت ہے۔ مگر ذرا غور سے دیکھو۔

کیا یہی وہ فردوسِ بریں ہے جس کی تم سیر کر چکے ہو؟ (یہ کہہ کے شہزادی مسکراتی۔)

حسین: بعینہ وہی مقام معلوم ہوتا ہے۔ خداوند امیں خواب دیکھتا ہوں یا بیدار ہوں! اور دیکھیے طیور کے لفقوں سے بھی وہی آواز لگتی ہے۔ السلام علیکم طبیعت فی ذخیراً ابا خالد ؓ

باغان خاتون: اس کے کیا معنی؟

حسین: اللہ جل شانہ نے قرآن پاک میں وعدہ کیا ہے کہ جنت میں لوگوں کا خیر مقدم ادا کیا جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پر سلام ہو۔ پاک ہو گئے تم لوگ۔ الہذا ہمیشہ کے لیے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

حسین نے زبان سے تو یہ جواب دے دیا مگر اس کے دل و دماغ اور اس کی آنکھوں پر ساعت

بساعت زیادہ حیرت مبتولی ہوتی جاتی تھی۔ وہ ہر چیز کو گھبرا گھرا کے دیکھتا اور بار بار کہہ اٹھتا ”یا تو میں آسمان پر پہنچ گیا ہوں یا فردوسِ بریں نیچے اتر آیا ہے۔ یہ تو بعینہ وہی باش ہے جس میں زمرد کے ساتھ سیر کرتا پھرتا تھا۔“

بغان خاتون: فردوسِ بریں میں تم پہنچ گئے۔ اب مطمئن رہو۔ زمرد سے بھی ملاؤ دوں گی۔ حسین کو جنت میں پہنچ جانے کا یقین ہو گیا تھا۔ شہزادی کی زبان سے یہ فقرہ سنتے ہی اس کے قدموں پر گر پڑا اور کہنے لگا:

”آپ نے اس راہ میں میری رہبری کی ہے۔ مجھے اب شیخ علی وجودی سے بھی دستگیری کی امید نہ تھی۔ آپ کا یہ احسان ہمیشہ میرے لوح دل پر نقش رہے گا۔“

بغان خاتون: (حسین کو زمین سے اٹھا کے) ذرا صبر و تھم سے کام لو۔ زمرد سے ملنے کے لیے شرط ہے کہ چپکے سے ساتھ ساتھ چلے چلو۔ ایسا اضطراب کرو گے تو کام بگڑ جائے گا۔ یہ کہہ کے شہزادی نے پھر زمرد کا خط نکال کے پڑھا اور دونوں ہمراہ یوں کو ساتھ لیے ہوئے ایک جانب چل کھڑی ہوئی۔ چند منٹ میں وہ قصروں اور کوشکوں کے قریب تھی۔

حسین اس نظر فریب منظر کو کھڑا نہایت ہی حیرانی واخود رفتگی کی نظروں سے دیکھ رہا تھا کہ ناگہاں ایک حسین و ناز نہیں عورت شہزادی کے سامنے آئی اور اس کے پاؤں پھومنے کو جھکی۔

بغان خاتون: تم کون ہو؟ (مگر اس کے ساتھ ہی حسین کی نظر اس پر جا پڑی۔ ایک بے اختیاری و خود فراموشی کے جوش میں اس کی زبان سے انکا ”زمردا“ اور دوڑ کے اس سے لپٹ گیا۔)

زمرد: (حسین کو علیحدہ کر کے) ذرا صبر سے کام لو۔ پہلے مجھے شہزادی کے سامنے اپنی احسان مندی ظاہر کرنے دو۔

بلغان خاتون: تو تم ہی زمرد ہو۔ (یہ کہہ کر اس نے زمرد کو گلے سے لگالیا اور بولی) ”بہن، میرا کیا احسان ہے۔ ہاں تمہاری البتہ انتہا سے زیادہ شکر گزار ہوں۔ اگر تم مد نہ کرتیں تو مجھے غم والم سے نجات نہ ملتی۔

زمرد: (مسکرا کے کسی قدر نداشت سے) مگر شہزادی، اس میں میری خود غرضی بھی تو تھی۔

بلغان خاتون: اسے خود غرضی نہ کہنا چاہیے۔ یہ اس سادہ لوح نوجوان پر تمہارا احسان ہے کہ اپنی محبت سے اسے عزت بخشی اور اتنے بڑے اور اس قدر گہرے فریب سے نجات دیا۔ اس کے بعد زمرد حسین کی طرف متوجہ ہوئی اور پوچھا ”اب تو تم پر سارا راز گھل گیا؟“

حسین: راز کیسا؟ میں نے شہزادی کے حکم کی اطاعت کی اور صرف اس وجہ سے کہ تمہاری ہدایت تھی۔

بلغان خاتون: نہیں۔ ابھی میں نے ان سے کچھ نہیں کہا اور نہ تمہارا کوئی خط و کھایا ہے۔ مگر جب سے یہ باغ میں داخل ہوئے ہیں انتہا سے زیادہ پریشان ہیں اور بدحواس ہیں۔ اب اپنے ساتھ لے جاؤ اور جو کچھ کہنا ہو کہہ دوتا کہ ان کی وحشت ذرا دور ہو اور آدمی نہیں۔

زمرد: افسوس! غلطی میں یہ ایسے ایسے کام کر چکے ہیں کہ اطمینان تو انھیں بڑی مشکلوں سے نصیب ہو گا۔

بلغان خاتون: لیکن اب یہی مصلحت ہے کہ انھیں اپنے قصر میں لے جاؤ اور کوشش کرو کہ ان کی آنکھیں کے سامنے سے فریب کا پردہ اٹھ جائے۔ مگر ہاں، پہلے مجھے یہ بتا دو کہ یہاں کسی کا خوف تو نہیں؟ تمہارے لکھنے کے مطابق میں آنے کو تو چلی آئی مگر اندر یہ شہ بے کوئی خرابی نہ اٹھ کھڑی ہو۔

زمرد: شہزادی! آپ مطمئن رہیے۔ کسی بات کا اندر یہ نہیں۔ آج شام تک آپ یہاں بے کھلکھلے رہ سکتی ہیں۔ مگر وہ جو میں نے لکھا تھا، اس کا بھی بندوبست آپ نے کر لیا ہے؟  
باغان خاتون: سب سامان کر چکلی ہوں۔ اگرچہ اس کے متعلق مجھے ذرا سماڑ دو ہے۔

زمرد: وہ کیا؟

شہزادی: خیر، کوئی مصائب نہیں۔ اس کو پھر بیان کروں گی۔  
یہ کہہ کہ اس نے باقی ماندہ جوان کو بھی جو ساتھ آیا تھا کچھ کان میں کہہ کے واپس بھیجا اور زمرد سے پوچھنے لگی ”یہ بتاؤ، قافعہ پر کہہ سے حملہ ہو سکتا ہے؟“

زمرد: آپ قافعہ میں ہیں۔ مگر اتنا دھنہ قافعہ سے علیحدہ کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ غیر لوگ نہر ویرنجان کے ذریعے سے اور بیرونی دیوار کے نیچے سے نکال کے لائے جاتے ہیں مگر اسی نہر کے اس طرف خور شاہ کا محل ہے۔

حسین: (چونکر) خور شاہ کا محل! وہ یہاں کہاں؟ وہ تو الموت میں ہے۔

باغان خاتون: (ہنس کے) اب انھیں ان کے قصر وہ میں وہیں پہنچا دو جس کے دیکھنے کا نہیں شوق ہو گا۔ باقی با تھیں پھر آ کے کرنا۔ یہ اگر یہاں موجود ہے تو بات نہ کرنے دیں گے۔

زمرد: بے شک شہزادی۔ آپ بجا فرماتی ہیں۔ انھیں وہاں بٹھا کے ابھی آتی ہوں۔

یہ کہہ کے اس نے حسین کا باتھ باتھ میں لیا، جو ایک خود فراموشی کے عالم میں لکھا تھا اور شہزادی کو تنہا چھوڑ کے اُسے کھینچتے ہوئے اپنے قصر دری میں لے گئی۔ حسین راستے بھراں سے طرح طرح کے سوالات کرتا رہا مگر زمرد نے ہر سوال کے جواب میں یہی کہا کہ پھر بتاؤں گی اور اُسے قصر میں بٹھا کے شہزادی کے سامنے واپس آئی۔

باغان خاتون: ہاں تو، خورشاد کے محل کو یہاں سے راستہ گیا بے؟

زمرد: جی ہاں۔ وہ روز یہاں آ کے عیش و عشرت میں مشغول ہوا کرتا ہے۔ آپ اس راستے سے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ بے آسانی پہنچ جائیں گی۔ پہلے نہر کا پل ہے۔ اُس سے اُترتے ہی آپ کو ایک راستہ ملے گا جو سیدھا خورشاد کے حرمہ سرا کو گیا ہے جس میں داخل ہوتے ہی آپ سمجھو لیجیے کہ الگوت کے قلعے میں پہنچ گئیں۔ اور آن عید کا دن ہے اور معمول ہے کہ اس زمانے میں کوئی شخص نہ جنت میں لا یا جاتا اور نہ خورشاد آ سکتا ہے۔ اس لیے کہ اس علاقے کے تمام معزز اور مقرب لوگ نیز دُور دُور کے برسرا آ وردہ نقیب امام کی زیارت کو آتے ہیں، اور قلعے میں عام معتقدین کا بڑا بھاری مجمع رہتا ہے۔ اسی خیال سے میں نے آپ کو رمضان کی ۲۷ تاریخ کو بیلا یا ہے، کیونکہ اس دن لازمی طور پر یہ باعث غیروں سے خالی رہتا ہے اور خود خورشاد کو بھی تین چار دن تک یہاں آنے کی فرصت نہیں ملتی۔ اگر اور کوئی زمانہ ہوتا تو اب تک آپ کے آنے کا حال قلعے میں معلوم ہو گیا ہوتا۔

باغان خاتون: تو ابھی تک کسی کو ہمارے آنے کی خبر نہیں؟

زمرد: بالکل نہیں۔ اوقل تو یہاں کوئی مرد نہیں جو لوگوں کو خبر کر کے لڑائی کا سامان کرے اور شاید کوئی عورت بھاگ کے چلی بھی جاتی مگر میں نے آج صحیح سے شہر کے پل کے پھانک میں ٹھفل لگا دیا ہے اور ٹھنچی میرے پاس ہے۔ لہذا ممکن نہیں کہ کوئی بھی بھاگ کے قلعے میں جا سکا ہوا اور اُطف پر کہ ان دنوں ادھر سے بھی کوئی آنے والا نہیں۔

باغان خاتون: یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ تم کہتی ہو آن عید ہے، جب کہ قلعے میں خوشی کا جوش و خروش ہو گا۔ پس کوئی فکر نہیں۔ آن شام سے پہلے ہی ہمارا حملہ ہو جائے گا۔ مگر زمرد مجھے ایک بات

کا تردد ہے۔ جس فون کو میں نے اپنی مدد کے لیے بُلا�ا تھا، اُس کا بھی تک پتا نہیں۔ میرے ہمراہ صرف پانچ سو ساہی ہیں جو شاید کافی نہ ہو سکیں۔

زمرد: میں تو صحیتی ہوں کہ پانچ سو جوان بھی قلعے پر ادھر سے جا کر قبضہ کر لیں گے۔

بلغان خاتون: مگر مجھے یقین ہے کہ ہماری کمک آئے گی ضرور۔ صرف شام تک کی مہلت چاہیے۔

زمرد: شام کیا معنی، آپ کل تک یہاں مخفی رہ سکتی ہیں۔ کوئی اندر یہے کا مقام نہیں۔ پس جب تک کمک آئے، یہاں آ رام فرمائیے۔ آپ تھک بھی گئی ہوں گی۔ ستانے کے لیے اچھی مہلت مل گئی۔ اس کے بعد شہزادی نے پوچھا، اور زمرد، یہ لباس جو تم نے میرے دونوں ساتھیوں کے لیے تجویز کیا ہے، اسکیں کیا مصلحت تھی؟،

زمرد: آپ کا لباس تو وہی دو روں کا لباس ہے جس کو لوگ یہاں حلہ جنت سمجھتے ہیں۔ اس لباس کی وجہ سے کسی پر بدگمانی نہیں ہو سکتی۔

بلغان خاتون: شاید اسی لیے مجھے وہ کپڑے پہنے دیکھ کے حسین نے کہا تھا کہ آپ حور معلوم ہوتی ہیں۔

یہ جملہ سُن کے زمرد بھی نہی اور بولی، مگر اپنے لباس کے متعلق انہوں نے کچھ نہ کہا؟

بلغان خاتون: اور ہاں، مردوں کے لیے ایسا بے ہودہ لباس تم نے کیوں تجویز کیا؟

زمرد: اس لیے کہ مردوں میں یہاں عام طور پر وہی دودھوارے آیا کرتے ہیں جو یہاں کی نہروں اور حوضوں میں دودھ اور شراب بھرتے ہیں۔ اگر کوئی مرد اس لباس کو پہنے ہوئے یہاں آئے تو کسی کو بھی خیال نہ ہو گا کہ کوئی غیر ہے۔

بلغان خاتون: مگر ایسا نہ ہو کہ کسی کو خبر ہو جائے اور قبل از وقت راز کھل جائے۔

زمرد: کسی کو خبر نہ ہو گی۔ آپ شوق سے یہاں فروکش ہوں۔ عید کے دن کسی کو یہاں آنے کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔

بلغان خاتون: بہتر، میں یہیں پھر ہوں گی۔ مگر مجھے چل کے ذرا جنت کی سیر کراؤ اور پُل سڑک بھی دکھا دوتا کہ راستہ خوب پہچان لوں۔

زمرد: چلیے۔

اس تجویز کے بعد دونوں حسین و ناز نیں عورتیں قصر وں اور کوشکوں کی سیر کرتی اور باغوں اور چمنوں کی بہار دیکھتی ہوئی اس بڑی نہر کے کنارے پر پہنچیں جس کے راستے سے لوگ سونے کی کشتی میں بٹھا کے جنت کے اندر لائے جاتے تھے۔ اس نہر کے پُل کے پھاٹک میں قفل لگا ہوا تھا جسے زمرد نے کھوا اور دونوں لڑکیاں دوسری وادی کے میدان میں اتریں۔ ادھر بھی ایک پھولوں کا مسٹح تختہ دُور تک بنا ہوا تھا اور درمیان میں سے ایک سڑک گزرتی تھی جو تھوڑی دُور تک کھلی فضائیں جا کے بڑے سایہ دار درختوں کے ایک چھنڈ میں غائب ہو گئی تھی۔ انھی درختوں کے اُس طرف حرم سرا کا راستہ تھا۔ یہ دلچسپ سیر کر کے شہزادی واپس آئی اور زمرد کے انتخاب کے مطابق عالی شان فیروزہ کے کوشک میں جا کے فروکش ہو گئی۔ زمرد دیر تک اُس کے پاس بیٹھی رہی اور جب دیکھا کہ شہزادی لیٹ کے آرام کیا چاہتی ہے تو اُس سے رخصت ہو کے دروازہ اندر سے بند کروادیا اور اپنے قصر کی طرف روانہ ہوئی۔

## افشاۓ راز

حیرت زدہ حواس باختہ نوجوان حسین کو زمرِ دشہزادی کی تجویز کے مطابق قصر دری میں چھوڑ کے واپس گئی تو وہ گھبرا کے ایک ایک کو دیکھتا اور اپنے دل سے پوچھتا تھا کہ کیا حقیقت میں یہ وہی مقام ہے جہاں وہ امامِ قائم قیامت کی وجہ سے آیا تھا۔ مگر وہ تو ملاعِ اعلیٰ پر تھا اور یہ زمین ہی پر ہے۔ لیکن کیوں کر شک کیا جائے۔ خود زمرِ دبھی تو موجود ہے۔ اگر یہ کوئی دنیاوی باغ ہے تو وہ کیوں کر چلی آئی؟ خود اسی نے لکھا تھا کہ جنت میں ہوں اور فردوس میں کی سیر کر رہی ہوں۔ آخر سے جھوٹ بولنے سے کیا فائدہ؟

اس کے بعد وہ محل کے برآمدے میں جا کھڑا ہوا اور ہر ایک عمارت، ایک ایک چمن کو غور سے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگا۔ ہر چیز وہی اور ویسی ہی تھی۔ جیسی کہ پہلے نظر سے گزری تھی۔ قصر وہ کی روکار پر اسی طرح جو ہرات جزے ہوئے تھے۔ ان کی وضع بھی ویسی ہی تھی۔ چمنوں کا بھی وہی رنگ اور وہی نقشہ تھا۔ سڑکیں اور روشنیں بھی اسی طرح رنگ برنگ اور نظر فریب تھیں۔ سونے چاندی کے تخت و تنان بھی اسی پہلی شان سے تھے۔ نہریں بھی اسی متانہ روی سے بہ رہی تھیں۔ ہاں صرف ایک چیز کی کمی تھی، اور وہ وجد میں لانے والا گانا تھا۔ مگر جب اس نے طیور کی زبان سے وہی ترانہ، خیر مقدم مُسُن لیا تو ادھر سے بھی شک جاتا رہا۔ وہ اسی پس و پیش میں تھا کہ ایک طائر نے ایک تازہ اور شاداب سیدب چونچ میں لانے کے سامنے ڈال دیا۔ ”یہ بھی خاص فردوس میں کی علامت ہے۔“

حسین کے خیالات میں ایک عجیب قسم کا تردد و اضطراب تھا۔ یہ معملاً کسی طرح حل ہونے میں نہ پایا

تحاکہ سامنے سے زمر دنظر آئی جو شہزادی سے رخصت ہو کے اُس کے پاس آ رہی تھی۔ اس کی دل رُبا اور ناز آفریں صورت دیکھتے ہیں وفورِ جوش سے حسین کا دل دھڑ کنے لگا اور عشق کے جذبات نے یک بیک ایسی بے اختیار حالت طاری کی کہ برآمدے سے اتر کے استقبال کو دوڑا اور دونوں ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔

حسین: پیاری زمرد! اللہ بتاؤ کہ میں کس عالم میں ہوں اور یہ کیا دیکھ رہا ہوں؟  
زمرد: (مسکرا کے) وہی دیکھ رہے ہو جو ایک دفعہ دیکھ چکے ہو۔

حسین: یعنی وہی ملاعِ اعلیٰ پر ہوں؟  
زمرد: واقعی جو ساز و سامانِ نظر آ رہا ہے اس لحاظ اس جگہ کو ملاعِ اعلیٰ ہی کہنا چاہیے۔  
حسین: کہنا چاہیے؟ تو کیا اصل میں نہیں؟

زمرد: تم اپنے دل سے پوچھو۔ تم نے اس مقام کو زمین پر پایا آسمان پر؟  
حسین: آیا تو زمین ہی کے راستے ہوں۔

زمرد: تو زمین ہی پر سمجھیں۔  
حسین: مگر کیوں کر سمجھوں؟ تمہاری قبر پر تمہارے وہ خطوط یہاں تک آنے کے ذریعے ہیں۔  
ان تمام باتوں میں جس چیز کا خیال کرتا ہوں، اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ کوئی اور عالم ہے اور یہاں کی مشرتوں میں دنیاوی مشرتوں سے بالا ہیں۔

یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں قصر میں داخل ہوئے اور زمرد نے کہا ”یہاں کی مشرتوں تو بے شک دنیا کی مشرتوں سے بالا ہیں مگر یہ نہ سمجھو کہ تم دنیا سے نکل کے کسی اور جگہ آ گئے ہو۔

حسین: پھر وہ سب واقعات جو گزر چکے ہیں، ان کی نسبت کیا خیال کروں؟

زمرد: یہ سب میری مجبوری، میری بے دست و پائی اور تمھاری سادہ لوچی کا نتیجہ ہے۔

حسین: میں اس کا مطلب نہیں سمجھا؟

زمرد: گھبراو نہیں۔ سب سمجھ جاؤ گے۔ مگر فسوس! جس قدر سمجھو گے، اُسی قدر زیادہ پریشان ہو گے اور اپنے کیے پر پچھتا ہو گے۔

حسین: زمرد! اب مجھے تیری صورت پر بھی شے معلوم ہوتا ہے۔ تو وہی زمرد ہے جو میرے ساتھ آمیل سے آئی تھی؟

حسین کی زبان سے سادگی کا سوال سن کے زمرد کو بنسی آئی مگر ضبط کیا اور ایک عجیب دل فریب ادا کے ساتھ پر معنی اور شوخ چھتوں سے دیکھ کے بولی ”نہیں۔ دوسری ہوں۔“ اس جواب کو حسین نے سنایا نہیں تھا۔ اس نے زمرد کا باتھا اپنے ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھ کے بولا ”وہی نورانی جسم ہے یا میرے ہی جسم کا ساماذی پُتلہ؟“

زمرد: ہوش کی باتیں کرو۔ تم بالکل از خود رفتہ ہوئے جاتے ہو۔ تمھاری آنکھوں کے سامنے سے ایک بہت بڑا طسم ٹوٹا ہے۔ جس کے اثر سے تمھارے جواں ٹھکانے نہیں رہے۔ ذرا ہوش میں آؤ اور جواں کی باتیں کرو کہ سارا راز، تمام سرگزشت بیان کروں۔

حسین: پیاری زمرد، جلدی بیان کرو۔ اس لاعلمی اور ناواقفی نے مجھے دیوانہ کر رکھا ہے۔

زمرد: اُس وادی میں ہم دونوں نے جن پر یوں کو دیکھا تھا، وہ پریاں نہ تھیں بلکہ اسی مصنوعی جنت کی حوریں تھیں۔

حسین: (حیرت سے بات کاٹ کے) مصنوعی جنت! یہ وہ جنت نہیں جس کا وعدہ مومین سے کیا گیا تھا؟

زمرد: ذرا صبر کرو۔ خیر، تم وہاں بے ہوش ہو گئے اور مجھے وہ یہاں پکڑ لائیں۔ نہ میں ماری گئی نہ شہید ہوئی۔ مگر اس لیے کہ تم کو میرے مرنے کا یقین آ جائے، انھوں نے واپسی سے پہلے بھائی کی قبر میں ذرا تغیر پیدا کیا اور اُسی وقت رات کو مجھ سے پوچھ کے بھائی کے نام کے برابر میرا نام بھی کندہ کر دیا۔ اس سے غرض صرف یہ تھی کہ تم مجھ سے مایوس اور میرے خیالوں سے دست بردار ہو کر چلے جاؤ۔ اس وادی کی خطرناک حالت ہرملئے والے سے بیان کرو اور یہاں کی پریوں کی اہمیت ہر شخص کے دل میں بٹھا دو۔

حسین: تم تو زندہ ہو (یہ کہا اور زمرہ دکھر سے پاؤں تک گھور کے دیکھنے لگا۔)

زمرد: (جھنجھلانے کے) نہیں چڑیل ہو گئی ہوں (حسین نے کچھ اس کا جواب نہیں دیا اور زمرہ نے ایک لمحہ توقف کر کے پھر سلسلہ کلام شروع کیا) تو تم کو یہ دھوکہ دیا گیا اور میں یہاں لانے کے بعد انھی عورتوں میں شامل کر دی گئی جو یہاں گھوریں کھلاتی ہیں۔ چند روز بعد دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ تم اُسی طرح میری قبر کے مجاور بننے بیٹھے ہو اور جانے کا نام ہی نہیں لیتے۔ آخر یہاں غور کیا گیا کہ وہ وادی تم سے کیوں کر خالی ہو۔ اکثر وہ کی رائے تھی کہ قتل کر ڈالنا چاہیے۔ مگر اتفاق سے میری تدبیر کا رگر ہوئی اور تجویز قرار پائی کہ کسی ایسے طریقے سے تمھیں وطن جانے کی ہدایت کی جائے کہ کسی کا گاؤں ثابت نہ ہو اور تم بغیر اُس کے کسی قسم کی بدگمانی کرو، وہ وادی چھوڑ دو۔ اس تجویز کا نتیجہ میرا پہلا خط تھا جس میں تم سے میری وصیت پوری کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ وہ خط میرے ہی ہاتھ سے لکھا گیا اور مجھ سے حالات دریافت کر کے اُس کے مضمون کا مسودہ تیار کیا گیا۔ مگر حسین! وہ خط صاف کرتے وقت میں چکے چکے بہت روئی تھی۔ اس لیے کہ جانتی تھی

کہ خود اپنے ہاتھ سے دامنی مفارقت کا سامان کر رہی ہوں۔ خیر، وہ خط تمہارے پاس گیا تو معلوم ہوا کہ اب بھی تم اسی طرح بیٹھے ہو اور گویا تمہارے ارادے میں تبدیل نہیں ہوتی۔

حسین: بے شک نہیں ہوتی تھی۔ زمرد، میں تو مر جاتا اور وہاں سے نہ ہتا۔

زمرد: جب یہ معلوم ہوا تو ان لوگوں کو پھر فکر پیدا ہوتی۔ کئی مرتبہ خود مجھ سے کہا گیا کہ یہ تدبیر بے شود ہوتی۔ اب کیا کیا جائے؟ اب کوئی تدبیر میرے ذہن میں نہ آتی تھی اور دل میں ڈر رہی تھی کہ کہیں یہ غصب نہ ہو کہ یہ لوگ تمہارے مارڈا لئے پر آمادہ ہو جائیں۔ اتنا قافی خیال دنوں میں خبر آتی کہ امام نجم الدین غیاثا پوری باطنیین کے خلاف وعظ کر رہے ہیں اور تدبیر میں کی جا رہی تھیں کہ کس فدائی کے ہاتھ سے وہ قتل کرا دیے جائیں۔ کم بختنی یا شامت اعمال سے میری زبان سے نکل گیا کہ وہ تمہارے پچھا اور تمہارے استاد و مرشد ہیں۔ یہ خبر جیسے ہی یہاں کے بادشاہ خور شاہ کو پہنچی اُس نے خیال کیا کہ وہ امام عالی مقام تمہارے ہاتھ سے قتل ہوں تو زیادہ مناسب ہے۔ اس طرح زمانے بھر کو معلوم ہو جائے گا کہ مذہب باطنیہ دلوں پر کس قدر گہرا اثر ڈالتا ہے کہ انسان اپنے عزیز واقارب، استاد و مرشد تک کی پروانہیں کرتا۔ تمہارے خبر سے ان کا قتل ہونا ایک ساتھ ان باتوں کا ثبوت دے سکتا ہے کہ بنتیجے نے پچھا کو، شاگرد نے استاد کو مرید نے مرشد کو باتاتا مل ثواب سمجھ کے قتل کرڈا۔

زمرد نے یہاں تک کہا تھا کہ حسین نے بے اختیار ایک سختی سانس لی اور آبدیدہ ہو کے کہنے لگا۔ افسوس! میں نے شفیق بزرگ اور خدا شناس مُرشد کے خون سے اپنے ہاتھ رنگے۔ زمرد ایہ تیرے ہی شوق میں اور تیری ہی ہدایت کی وجہ سے تھا ورنہ میں اتنے بڑے ظلم کی ہرگز جرأت نہ کرتا۔

زمرد: حسین! میں نے پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہتی ہوں کہ اس گناہ میں مجھے شریک نہ

کرو۔ مجھے جب اس کا خیال آ جاتا ہے تو کانپ اٹھتی ہوں۔ مگر اس ذکر کو جانے ہی دو۔ ایک ہونے والی بات تھی جسے کوئی نہ روک سکتا تھا۔ میں نے اگر تمہیں اس کام کے لیے تیار کیا تو میں اپنے بس میں نہ تھی اور تم اگر آمادہ ہو گئے تو تم اپنے ہوش میں نہ تھے۔

حسین: (زور سے سینہ پیٹ کے) مگر افسوس زمرد! یہ غدرِ خدا کے سامنے نہ کیے جائیں گے میں نہ ہوش میں تھا نہ بے ہوش۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک گناہ عظیم کر رہا ہوں مگر تیرا شوق بار بار دل کو اٹھا کے آمادہ کرتا تھا۔

زمرد: (بے تابی سے بات کاٹ کر) پھر میرا نامِ خدا کے لیے حسین مجھے اپنے ساتھ نہ لے جاؤ۔ (آن سو بہا کے) میں نے کچھ کیا ہے، مجبوری اور بے بسی میں۔ افسوسِ اخود اپنے دل سے تو اعنت کی آواز سن رہی ہوں، تمہاری زبان سے بھی وہی سُنی ہوں۔

یہ کہہ زمرد زار و قطار رونے لگی۔ حسین نے بے اختیاری کے ساتھ جلدی سے اس کے آنسو پوچھے اور کہا:

”زمرد! بے شک ٹوبے خطابے۔ اگر میں نے تیراول دکھایا تو معاف کراور آگے بتا کہ پھر کیا ہوا؟“

زمرد: (روم سے آنسو پوچھ کر) پھر تم کو دوسرا خط ملا جس میں تمہیں کوہِ جودی کے غار اور شہرِ خلیل کے تھے خانے میں چلہ کشی کرنے اور پھر حلب جا کر شیخ علی و جودی سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ خط بھی اسی طرح بھیجا گیا کہ اس کا مسوہ لکھ کے مجھے دیا گیا اور جب میں نے اپنے ہاتھ سے صاف کر دیا تو میری قبر پر رکھوا دیا گیا۔

حسین: لیکن اگر اتنا ہی کام تھا کہ امام نجم الدین نیشا پوری قتل کرڈا لے جائیں تو مجھے اتنے چکر

کیوں دیے گئے اور میرے راستے میں بے کار کی دشواریاں کیوں پیدا کی گئیں؟

زمرد: اس لیے کہ تمہارے شوق میں یہجان اور بے صبری پیدا ہو۔ اگر بغیر اتنے چلے کھنچوائے اور بغیر علی وجودی کے پاس ایک سال تک انتظار کرنے کے کہہ دیا جاتا تو تم اتنے بڑے گناہ کے ارتکاب پر ہرگز آمادہ نہ ہوتے۔

حسین: زمردا تیرا شوق میرے دل میں اس قدر تھا کہ جس کام کو کہا جاتا، اُسی وقت پورا کرنے کو تیار ہو جاتا۔

زمرد: خیر، تو ان کو نہیں معلوم تھا کہ تم اتنے بے وقوف ہو اور تمہارے اخلاق اس قدر کمزور ہیں۔

حسین: مگر کیوں کر کبوں زمردا مجھے تیری باتوں کا یقین نہیں آتا۔ ان آنکھوں سے ایسی ایسی کرامتیں اور عقل انسانی سے اس قدر بالا باتیں دیکھے چکا ہوں کہ ان لوگوں کی خداشناسی سے انکار کرنے کی کسی طرح جرأت نہیں ہوتی۔ جن گدھوں پر ہم دونوں سوار ہو کے یہاں آئے تھے وہ تو مر چکے تھے مگر مجھے ایک نیا تازہ دم گدھا اُسی درخت سے بندھا ملا اور ایسا خوبصورت تو انا و تندرست اور تیز روکہ اس وقت تک میں یہی سمجھتا تھا کہ میری سواری کے لیے خاص خدا کے پاس سے آیا تھا۔

زمرد: وہ گدھا یہیں سے بھیجا گیا تھا۔ جس وقت تمہارے نام کا خط قبر پر رکھوا یا گیا تھا، اُسی وقت وہ گدھا ایک دوسرے راستے سے بھیج کر اس درخت سے بندھوایا گیا تھا۔

حسین نے اس جواب کو حیرت سے سننا اور بولا "عجب! مگر پھر بھی میرے شبہات دور نہیں ہوتے۔ آخر شیخ وجودی کو میرے سب حالات کیوں کر معلوم ہو گئے؟ وہ یہاں سے دس ہزار کوں کے فاصلے

پر ہیں۔“

زمرد: تمہارے روانہ ہونے کے ساتھ ہی ان کو تمام واقعات کی خبر دی گئی۔ ان کو لکھ بھیجا گیا تھا کہ امام نجم الدین کے بھتیجے، شاگرد اور مُرید سے ان کے قتل کا کام لینا ہے اور وہاں پہنچنے سے پہلے تم کوہ جودی کے غار اور خلیل کے تھانے میں چلہ کھینچو گے۔ یہ سب باتیں ان کو دوسرے ذریعے سے معلوم ہو چکی تھیں مگر انہوں نے غیب دانی اور کرامت کی شان سے بیان کر کے تمہیں اپنا فریفتو بنا لیا۔

حسین نہایت ہی متعجب تھا۔ وہ حیرت کے دریا میں غرق تھا اور کسی طرح رہائی نہ ملتی تھی۔ زمرد اپنی بات پوری کر کے خاموش ہو گئی اور وہ سوق میں پڑا تھا کہ آخر اس نے سخت حیرت زدگی کی شان سے آنکھیں اٹھا کے دیکھا اور کہا کہ یہ سب باتیں تو سچ کہہ رہی ہے یا مجھے دھوکا دے رہی ہے؟ مجھے تو اپنی گزشتہ زندگی ایک خواب سی معلوم ہوتی ہے۔ مختر ڈدھوں کہ اس ملاقات اور ان سب باتوں کو خواب سمجھوں یا ان تمام واقعات کو جو تجھ سے مجاہد ہونے کے بعد پیش آئے؟ کیا حقیقت میں اتنا بڑا بے وقوف ہوں کہ ایسے عظیم الشان فریب اور جمل میں بنتا ہو گیا۔ لیکن زمرد اگر یہ سب سکھائی باتیں تھیں تو علی وجودی کو اُسی قدر حال معلوم ہوتا جس قدر یہاں بتایا گیا تھا۔ یہ کیوں کر معلوم ہو گیا کہ میں شہر خلیل کے مجاہروں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔

زمرد: حسین! تم حقیقت میں بڑے سادہ لوح ہو۔ اس کا سبب میں بغیر جانے سمجھ گئی اور تم نہیں سمجھ سکے۔ لیکن درحقیقت تم مجبور ہو۔ تمہارے دل و دماغ پر ہر طرف سے اتنا اثر ڈالا گیا کہ بمشکل ان باتوں کو اپنے دماغ سے نکال سکتے ہو۔ تم کو نہیں معلوم کہ باطنیں دنیا کے ہر کونے میں پھیلے ہوئے ہیں اور ان سازشوں کا جال ہرگاؤں اور چھوٹے قصے تک پڑا ہوا ہے۔ علی وجودی کے

ساتھ تم پورے ایک سال رہے۔ ممکن نہیں کہ اُس کا حال تمھیں نہ معلوم ہو گیا ہو۔

حسین: ہاں، میں نے البتہ یہ دیکھا کہ ان کے معتقد تمام اطرافِ عالم میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر سال ایک دفعہ ان کی زیارت کو بھی آتے ہیں۔ اور مجھے یہ بھی نظر آیا کہ وہ لوگ پوشیدہ طور پر اور صرف رات کو ممل کے چلے جاتے ہیں۔

زمرد: اسی سے سمجھ سکتے ہو کہ ان کے کان میں خبریں پہنچنے کے لئے بڑے ذریعے موجود ہیں۔ تم نے جس وقت اس وادی کو چھوڑا تھا آخروڑ حاب تک ہر منزل اور ہر مقام پر تمھاری نگرانی ہوتی ہو گی اور تمھاری روز روز کی خبر علی وجودی کو پہنچتی ہو گی۔ کچھ تم ہی پر منحصر نہیں، ان باطنیں کے پنجے میں جو شخص پڑتا ہے، اسی طرح نظروں میں رکھا جاتا ہے۔ پھر کیوں تعجب کی بات تھی اگر تمھاری شہر خلیل کی گرفتاری کا حال ان کو معلوم ہو گیا۔

حسین: مجھے اس پر حیرت نہیں۔ حیرت کی تو یہ بات ہے کہ شش کہتے تھے انھی کے اشارے سے باطنیں نے حملہ کر کے مجھے قید سے آزاد کرایا۔

زمرد: کوئی تعجب کی بات نہیں۔ بے شک اسی وجودی نے تمھارے چھڑانے کے لیے اپنے معتقدوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا ہو گا۔

حسین: مگر کیونکر حکم دے گا؟ میری گرفتاری کی خبر پہنچنے اور وہاں سے حملے کا حکم آنے میں بھی آخزمان لگتا۔ وہاں تو یہ واقعہ پیش آیا کہ جس رات میں نکلنے والا تھا، میرے باہر آنے سے پیشتر ہی خلیل کا حاکم باطنیں کے ہاتھ سے قتل ہوا اور پھر میں گرفتار ہوا تو اس کو پورا ایک دن نہیں گزرنے پایا تھا کہ ان کا ایک بڑا گروہ شہر میں آپڑا۔ ان تمام باتوں کی تکمیل اتنی جلدی کیوں کر ہو سکتی ہے؟

زمرد: (ذرا تامل کر کے) یہ کون مشکل ہے۔ باطنیں کو معلوم ہو گا کہ تم کس روز تھے خانے سے اترے تھے اور کس روز نکلو گے۔ اس زمانے میں انھوں نے شیخ علی وجودی کو خبر کر کے مدد کرنے کا شمارہ پالیا ہو گا۔ اُسی کے مطابق دن گئتے رب اور ٹھیک چالیسویں دن جس دن تم نکلنے والے تھے، انھوں نے رئیس شہر کو قتل کر دیا اکہ لوگ دوسرا فکر میں رہیں اور تم چپکے سے نکل کے بھاگ جاؤ۔ مگر جب انھیں خبر پہنچی کہ اس رئیس کے قتل سے بھی کچھ فائدہ نہ ہوا اور تم مجاہروں کے ہاتھوں میں گرفتار ہو گئے تو انھوں نے حملہ کر کے شہر میں کھلبی ڈال دی اور تمھیں جھوٹ کے بھاگ جانے کا موقع مل گیا۔

حسین: (زور سے سرد آہ بھر کے) تو زمرد، افسوس! یہ سب جھوٹ تھا۔ شیخ علی وجودی کا سا شخص اور اتنا بڑا مختار! کیوں کر گئے، زمرد! ان کرامتوں اور غیب دانی کے علاوہ ان کا علم و فضل اس پائے کا ہے اور ان کے ہر ہر لفظ سے ایسی خداشناسی اور آشنا ہے رموز وحدت ہونے کی بوآتی ہے کہ چاہتا بھی ہوں تو ان پر بدگمانی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ اتنا بڑا عالم و فاضل، ایسا نکتہ سچ و دقیقتہ رہے اور اتنا بڑا فرتی! میں امام نجم الدین کی صحبت میں رہ چکا ہوں۔ مگر پیاری زمرد! سچ کہتا ہوں کہ جو بات مجھے شیخ علی وجودی میں نظر آئی اور جس آسمانی سے وہ دل کے شکوک رفع کرتے ہیں، امام نجم الدین میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔

زمرد: بے شک ایسا ہی ہو گا۔ مگر بات یہ تھی کہ امام نجم الدین جو دل میں آتا ہو گا، سادگی اور بے تکلفی سے کہہ گزرتے ہوں گے۔ انھوں نے اُسے بنانے اور اپنا اثر ڈالانے کی بھی کوشش نہ کی ہو گی، اور شیخ علی وجودی کا ہر لفظ بنا ہوا اور دل پر اثر ڈالنے کے لیے ہوتا ہو۔ اس کے ہر فقرے میں پوری ریا کا رہی ہوتی ہے۔ جھوٹ اور سچ میں بھی فرق ہے۔ کیا فرتی! کی باتیں ایک راست باز

اور سادہ مزان شخص کی باتوں سے زیادہ دلچسپ اور زیادہ دل نہیں ہوا کرتی ہیں؟ یقین ہے کہ شیخ علی وجودی سے مل کے تم کو خداشناستی کا بہت عمدہ سبق مل گیا ہو گا۔

حسین: (زور سے سینے پر ہاتھ مار کے) ہاں! خوب سبق ملا۔ مگر حقیقت اس وقت معلوم ہوتی جبکہ پورا جادو اثر کر چکا اور میں ساری دنیا سے زیادہ ظالم، سیہ کار، بے دین اور بے قوف بن چکا۔ افسوس! اب تمام عمر پچھتاوں گا۔ مگر زمرہ دکیا کہوں، اب بھی یہ سب باتیں خواب معلوم ہوتی ہیں۔ طورِ معنی اور اس کے نورانی قصر کی صورت اس وقت تک میری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے۔

زمرد: ہاں! وہ بھی اس مذہب کا بڑا رُکن ہے۔ اس وقت صرف دو ہی شخص شادِ امُوت کو ملے ہیں جن سے اچھا نقیب وداعی اس مذہب باطنیہ کو نہیں نصیب ہو سکا۔ طورِ معنی اور علی وجودی جو یہاں وادی ایمن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ان دونوں نے اپنی گھری سازشوں سے صد ہا اُمر اوزرا اور علماء فضلاً قتل کر ڈالے۔ اور چوں کہ اس جنت و ملاءِ اعلیٰ کی اصلیت کو اچھی طرح جانتے ہیں، لہذا ان پر سارا فریب کھلا ہوا ہے اور لوگوں کو جان بوجھ کر گمراہ کرتے ہیں۔ طورِ معنی بھی لوگوں سے ملتا ہے۔ مگر وادی ایمن نے دنیا کو بہت خراب کیا۔ دین کو جتنا ضرر اس شخص کے ہاتھ سے پہنچا بے شاید بھی کسی کے ہاتھ سے پہنچا ہو گا۔

حسین: تو کیا طورِ معنی کے زمین دوز قصر میں بھی کوئی قدرتی کرشمہ نہیں؟ اس جنت کی طرح وہ بھی لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے بنایا گیا ہے؟

زمرد: (مسکرا کے) کیا تمہیں ابھی شک ہے؟

حسین: شک نہیں پیاری زمرد! تیری باتوں کا یقین ہے۔ مگر کیا بتاؤں کہ ان آنکھوں کے

سامنے سے کیسی کیسی کیفیتیں گز رچکی ہیں اور ان کا نوں سے کیسے کیسے روشن اور دلفریب الفاظ  
ئے ہیں۔ خیر یہ بھی نہ ہی، مگر طورِ معنی کا قصر تو اصفہان میں ہے۔ وہاں کے غار سے  
یہاں کیونکر پہنچ گیا؟

زمرد: الگوٹ کا نام چونکہ کسی قدر مشہور ہو گیا ہے اور بعض لوگ بھڑک گئے ہیں لہذا جن لوگوں  
کی نسبت ایسا خیال ہوتا ہے، وہ اصفہان اور طورِ معنی ابھی کے ذریعے سے یہاں بھیجے جاتے  
ہیں۔ اور سارا رازِ مخفی رکھنے کے لیے یہ تدبیر عمل میں لا آئی جاتی ہے کہ طورِ معنی انھیں بے ہوش کر  
کے اونٹوں کی قطار پر سوار کرتا ہے اور وہ راز دار اور معتبر سارے انوں کے ذریعے سے الگوٹ تک  
پہنچا دیے جاتے ہیں۔ ہر منزل پر رات کو کسی جگہ ان لوگوں کو بے ہوش میں لا کے کچھ کھلا پلا دیتے  
ہیں اور پھر یہ ہوش کر کے آگے روانہ ہوتے ہیں۔

حسین: (چونکر) میں نے بھی اپنے آپ کو کبھی جنگل میں پایا تھا اور کبھی پہاڑوں میں۔ تو اسی  
طرح میں بھی اصفہان سے روانہ ہو کے الگوٹ کے منازل کو قطع کر رہا تھا؟

زمرد: اور کیا۔

حسین: (حیرت سے) اور یہ لوگ انسان کو بے ہوش کیونکر کرتے ہیں؟

زمرد: ایک پتی سے، حشیش (بھنگ) اسی کے ذریعے سے۔ کبھی اس کا شربت پلا کے اور کبھی  
اسے غذاوں میں اور مٹھائیوں میں ملا کے۔

حسین: (بے صبری سے) تو طورِ معنی نے جو جامِ شراب پلایا، وہ اسی حشیش کا تھا۔

زمرد: بے شک۔

حسین: افسوس! مجھے مسلکرات بھی پائے گئے اور کوئی گناہ نہیں جو اٹھا رکھا ہو۔ تو ناراض نہ ہو

کیوں کہ صرف وصال کی آرزو نے مجھے اندرھا کر دیا تھا۔ ورنہ میں اتنا مجنون اور فاتر العقل نہ تھا۔ محبت کی یہ حالت ہے کہ تیرے بو سے کانشان جو میری پیشانی پر موجود ہے، مجھے دل و جان سے زیادہ عزیز ہے۔ میری یہ آرزو ہی رہی کہ اس نشان کا بوس لے کے اپنے دل کی تسلی کروں مگر یہ مشتاق ہونٹ کسی طرح وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

حسین کی ان باتوں پر زمرہ پچھا لیں شرما تھی کہ اس کے خاموش ہو جانے کے بعد بھی دیر تک آنکھیں پنجی کیے رہی اور کئی منٹ کے بعد جذباتِ شرم کو دبا کے بولی ”حسین بوس لینے سے نہ کسی شخص کے جسم پر داغ بن جاتا ہے اور نہ میں اتنی بے حیا ہوں۔“

حسین: (بات کاٹ کے) اچھا، تمہارے سو اور کس نے میرا بوس لیا ہو گا؟ میں نے کسی کو منہ تک تو لا گایا نہیں۔

زمرہ: (نظریں جھپکا کے) اب مجھ سے بے شرمی کی باتیں نہ کہلواؤ۔ یہم کو فریب دیا گیا ہے۔ یہ بوس کانشان ہے نہ عشق بازی کی پہچان۔ بلکہ یہ ایک علامت ہے جو ہر اس شخص کی پیشانی پر لوپے سے داغ کر بنائی جاتی ہے، جو اس جنت میں لا یا جاتا ہے؟

حسین: داغ ہوتا تو مجھے یاد ہوتا۔

زمرہ: یہ داغ بے ہوش کر کے بنایا جاتا ہے۔ اور جب تم الہوت سے اصفہان کی طرف جا رہے ہو گے، اسی وقت بنایا گیا ہو گا۔

حسین: (زور سے سینہ کوٹ کے) افسوس! افسوس! گل لینے گئے تھے، داغ لے آئے۔

اس کے بعد حسین دیر تک دل ہی دل میں اپنی حالت پر افسوس کرتا رہا۔ پھر ایک دفعہ چونک کر بولا۔ ”زمرہ، افسوس! بڑا دھوکہ ہوا۔ تو نے مجھے اس وقت کیوں نہ جتایا جب میں تیرے پاس لا یا گیا تھا۔“

اس وقت تو بھی مجھے یقین دلا رہی تھی کہ یہ سب ملائے اعلیٰ کی چیزیں ہیں۔“

یعنی کے زمر دا آبدیدہ ہو گئی اور ایک آواز میں بولی ”میری قسمت میں یہی لکھا تھا کہ تمھیں دھوکہ دوں گی۔“ زمر د کو آبدیدہ اور ملول پا کے حسین کے دل پر ایک چوتھی لگی اور بے اختیاری کے ساتھ باوفا معشوقہ کے آنسو پونچھ کے کہنے لگا ”زمر د، مجھے یہ خیال نہ تھا کہ اس سوال سے تیرے دل کو صدمہ پہنچے گا۔ اچھا، جا۔ وعدد کرتا ہوں کہ پھر بھی ایسی بات نہ پوچھوں گا۔“

زمر د: تم زخم پر نمک چھڑ کتے ہو۔ اس وقت تک تم نے سب کچھ پوچھا لیکن یہ نہ پوچھا کہ تم سے چھوٹ کے مجھ کم بخت پر کیا گزری۔ تم تو آزاد تھے۔ دنیا میں پھر رہے تھے۔ مگر آہا میں قید میں تھی۔ اور کیا کہوں کہ کس عذاب میں بتتا تھی۔ یہ بات میرے اختیار میں نہ تھی کہ کسی کو راز کا ایک ذرا سا اشارہ بھی دے سکوں۔ (اتنا کہہ کر زمر د اروقتار رو نے لگی۔)

حسین: (گلے لگا کر اور آنسو پونچھ کے) بے شک مجھ سے غلطی ہوئی کہ ان باتوں کا پوچھنا بھول گیا مگر سچ کہتا ہوں کہ میں نے اس وقت تک کوئی بات سوچ سمجھ کے نہیں پوچھی۔ جو کچھ پوچھا ہے، میں نے نہیں پوچھا بلکہ حیرت و بخودی پچھوارہی تھی۔ ایسی از خود رفتگی کی حالت میں کوئی فرد گزارشت ہو گئی تو معاف کر دو۔

زمر د: خیرا ب تم نے یہ داستان چھیڑی ہے تو سنو۔ یہ باشندوں اور باطنیوں کے اعتقاد میں توجہت الفردوس اور ملائے اعلیٰ کا عشرت کدھ ہے۔ مگر سچ پوچھو تو شاہانِ الگھوٹ کی عشرت کے لیے سراپا حرم کی حیثیت رکھتا ہے۔ ڈیز ہسو برس کی متواتر کوشش روز بروز اس کی رونق بڑھاتی ہے۔ اور چونکہ اس سے مدد ہی کام لیا جاتا ہے لہذا ہر چیز کے بنانے میں یہ کوشش کی گئی کہ اس کی خوش نمائی اور دل فریبی انسان کے حوصلے سے زیادہ اور اس کو مجوہ حیرت کر دینے کے لیے کافی ہو۔ یہ محل جو دیکھتے

ہو کہ سونے، چاندی، موںگے، موںتی کے نظر آتے ہیں صرف نقریٰ، طلائی جواہرات کے رنگ دیے گئے ہیں۔ ورنہ وہی ایسٹ اور چونا بے جس سے ہر جگہ مکان بنائے جاتے ہیں۔ نہروں کے جاری کرنے کا سامان موجود تھا۔ یہ بڑی نہر جو اس باغ کے درمیان میں بھی بے اور جس پر ایک شہری پل قائم ہے، وہی نہر ویرنجان ہے جس کے کنارے تم نے مدت توں آہوز اری کی ہے۔

حسین: (حیرت سے) وہی نہر ہے؟

زمرد: وہی، یہ خاص نہر شاہی قصر سے ہوتی ہوئی یہاں آتی ہے اور یہاں چندایسی گھاٹیوں میں ہو کے جن میں گزرنا غیر ممکن ہے، اس فرحت بخش وادی میں پہنچ گئی ہے۔

حسین: اور زمرد! وہ روشنی کیسی تھی جسے ٹو نے نور پریز دانی بتایا تھا؟

زمرد: وہ روشنی صرف یہ تھی کہ ارد گرد کے پھاڑوں پر رات کو بہت تیز روشنی اور مہتابیاں چھوڑی جاتی ہیں جن کا عکس یہاں کے آئینوں اور شیشوں پر ڈال کے قوی اور تیز کیا جاتا ہے۔ اس روشنی کا سامان صرف اس زمانے میں کیا جاتا ہے جب یہاں کوئی شخص معتقد بنانے کے لیے لایا گیا ہو۔ اس وقت سب کو حکم رہتا ہے کہ جب وہ روشنی تیزی سے چمکے تو چلا کے کہیں ہند الہدی مہاد عدنی تری۔ اور وہ دو اور شراب کے حوض بھی اسی ضرورت کے موقع پر لبریز کیے جاتے ہیں۔ لوگوں کا تختوں پر بیٹھنا اور غلامان کا شراب پلانا اور ان کی بے فکری و خالص مسترست کے تماشے بھی اسی موقع پر دکھائے جاتے ہیں۔

حسین: اور یہ طیور کا نغمہ اور ان کا پھل توڑ توڑ کے لانا؟

زمرد: یہ کون سی بڑی بات ہے۔ چند سدھائے طیور چھوڑ دیے گئے ہیں جن کو چلوں کے توڑ لانے اور بغیر چھیڑے ہوئے لوگوں کے سامنے رکھ کے اڑ جانے کی مشق کرا دی گئی ہے۔ اسی

طرح یہاں کے طیور کو قرآن پاک کی یہ آیت ”سَلَامٌ عَلَيْكُمْ طَبَقْتُمْ فَادْخُلُوا بَارِخَالْدِينِ۔“ یاد کرائی گئی ہے جس کو ہر وقت رٹا کرتے ہیں۔

حسین: بڑا گھر افریب ہے! بھاکوئی کیونکر سمجھ سکتا ہے۔ اور ہاں، زمر دا تو جنت کے راز بتانے میں اپنی سرگزشت کہنا تو بھول ہی گئی۔

زمرد: میری مصیبت کیا پوچھتے ہو۔ میں ہی تھی جوان سب آفتوں کو جھیل گئی۔ اور کوئی ہوتا تو اب تک خاک میں مل چکا ہوتا۔

حسین: نہیں، پیاری زمردا ایسی باتیں زبان سے نہ نکال۔ میرے دل کو صدمہ ہوتا ہے۔ خدا کا ہزار ہزار شکر ہے وہ مصیبتوں کٹ گئیں اور ہم پھر ایک دوسرے کے آغوش میں ہیں۔

زمرد: اصل میں میں صرف ایک حور بنانے کے لیے لائی گئی تھی۔ خورشاد اور اس کے ہمراز اہل دربار کو ہمیشہ کسی خوبصورت عورت کی خصیچو رہتی ہے تاکہ اس کے حسن و جمال سے جنت میں زیادہ دلچسپی پیدا کریں۔ جب میں خورشاد کے سامنے پیش کی گئی تو بد نسبی سے اس کی نظر میں معمول سے زیادہ اور جنت کی تمام حوروں سے بڑھ کے خوبصورت ثابت ہوئی۔ اس نے ارادہ کیا کہ مجھے خاص اپنے لیے مخصوص کر لے۔ میں یہ خبر سن کے انہا سے زیادہ پریشان ہوئی اور آخشدل میں فیصلہ کیا چاہے مارڈا میں جاؤں مگر اس بے عزتی کو گوارانہ کروں گی۔ ابتدا میں مجھے طرح طرح کے لائق دیے گئے۔ بتایا گیا کہ اس کی بی بی ہونے کے بعد تاج میرے سر پر رکھا جائے گا اور میں عالی مرتبہ ملکہ ہوں گی، مگر میں نے کسی طرح منظور نہ کیا۔ جب اسے میری رضامندی سے ما یوسی ہوئی تو وہ ظلم پر آمادہ ہوا اور مجھے طرح طرح کی تکلیفیں دی جانے لگیں۔ اڑھائی مہینے اسی حال میں گزرے۔ ہر گھر میں ہر پل موت کا انتظار کرتی تھی۔

معشوّقة باوفا کی یہ مصیبت و فاکیشی سُن کے حسین کی آنکھوں میں آنسو بھرا گئے اور ٹھنڈی سانس لے کے کہنے لگا۔ زمرد میرے لیے تو نہ بڑی مصیبتوں میں اٹھا گئی۔

زمرد: یہ مصیبت نہ تھی بلکہ میں اس کو راحت سمجھتی تھی۔ اس لیے کہ بے عذر تی اور آبروریزی سے بچی ہوئی تھی۔ اب خورشاہ ناکامی کے غصے میں میرے قتل پر آمادہ ہو گیا تھا۔ لیکن اتفاق سے کسی دوست نے رائے دی کہ ایسے کام جن کا کسی کے دل میں محبت پیدا کرنے سے تعلق ہو، خلم جو را اور زبردستیوں سے نہیں نکلتے۔ بہتر ہو گا کہ زمرد چند روز کے لیے جنت کے ایک محل میں چھوڑ دی جائے۔ وہاں جب ایک غر صے تک راحت و عشرت میں رہے گی تو اپنے رنج و غم بھول جائے گی اور آخر جوانی کے جذبات غالب آکے اُسے خود ہی آپ کی معشوّقة بننے پر آمادہ کر دیں گے۔ یہ رائے اُسے پسند آئی اور میں اُس کے محل سے لا کے اس جنت اور اسی قصر میں رکھ دی گئی۔ یہ ایسا محفوظ مقام ہے کہ خورشاہ کے خیال میں بھی نہیں تھا کہ یہاں کبھی پرند بھی پرمار سکے گا۔ باہر کا کوئی شخص نہ آ سکتا تھا۔ جو معتقد بنانے کے لیے بھی لائے جاتے تھے تو ان کی ہر طرف سے نگرانی ہوتی تھی اور کوشش کی جاتی تھی کہ سوا ایک دو بات کرنے کے میں ان سے زیادہ مل بھی نہ سکوں۔ اور وہ پر کیا خنصر ہے، جب تم سے ملی ہوں اس وقت بھی ان امور کی پوری نگرانی ہوتی تھی۔ یہ مجال نہ تھی کہ سوانع تمہارے بہکانے اور بہلانے کے میں تم سے ذرا بھی بے تکلف ہو سکوں۔ اب مجھے ہر بات کا آرام تھا۔ رات دن عیش و عشرت میں گزرتی تھی۔ خورشاہ کے اشارے کے موافق یہاں کی تمام حوریں میری اونڈیاں بنی رہیں۔ وہ ہر وقت میرا دل بہلانے کی کوشش کرتیں۔ حسین! یہ سب سامانِ عشرت موجود تھا مگر میرے دل کو کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ تمہاری صورت ہرگز ری آنکھوں کے سامنے رہتی اور طرح طرح کی تدبیریں سوچا کرتی تھی کہ

کسی طرح یہاں سے بھاگوں۔ انھی دنوں تمہارے قتل کے بارے میں مشورے ہوتے اور میرا ہو خشک ہوا کرتا۔ ایک رات کو میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے ایک لق و دق میدان میں کھڑی ہوں۔ ناگہاں سامنے سے تم آئے اور مجھ سے ملنے کو بے تحاشا دوڑے۔ یکاں کسی شخص نے ایک درخت کی آڑ سے نکل کر تمہارے سینے میں ایک پھری ماری۔ تم زخم کھاتے ہی سینہ پکڑ کے کھڑے ہو گئے اور میں بے اختیار روئی اور چینیں مارتی تمہارے قریب دوڑی۔ پس اسی حال میں چھنتے چھنتے میری آنکھ گھل گئی۔ اب کہاں چین پڑ سکتا تھا۔ باقی رات میں نے رو رو کے بسر کی اور صبح کو حیران و پریشان بیٹھی تھی کہ مر جان نام یہاں کی جو رجوبی مجھ سے کسی قدر مانوس ہو گئی تھی اور جس سے میں کبھی کبھی دو ایک باتیں کر لیا کرتی تھی، میرے پاس آئی اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد بولی ”زمردا تم نے کچھ اور بھی سنا ہے؟ وہ نوجوان حسین جو تمہارے ساتھ تھا، اب تک اُسی وادی میں تمہاری قبر سے لپٹا بیٹھا ہے۔“ اس موقع پر مجھے ضبط سے کام لینا چاہیے تھا مگر رہا گیا۔ بے اختیار ایک ٹھنڈی سانس لے کے بول اٹھی ”حسین اب تک وہیں ہیں؟“ مر جان: ہاں، مگر اب یقین ہے کہ ایک دو ہی روز میں وہ مقام ان سے خالی ہو جائے گا۔ میں نے گھبرا کے پوچھا ”کیوں؟“

مر جان: وہ مقام ہم لوگوں کی سیر گاہ ہے اور اسی سبب سے خورشاد چاہتے ہیں کہ وہاں کوئی ایسا شخص نہ رہے جو ہمارا راز نہ جانتا ہو۔ تمہارے ساتھی نوجوان کی نسبت پہلے تو یہ خیال تھا کہ جب بالکل مایوقی ہو جائے گی تو چلا جائے گا۔ اسی غرض سے تمہاری قبر بتا دی گئی ہے۔ پھر پر تمہارا نام کندہ کر دیا گیا ہے کہ تمہارے مرنے کا اسے یقین ہو جائے اور واپس ہو جائے اور لوگوں کو بھی ادھر آنے سے روکے۔ مگر یہ تدبیر بیکار گئی۔ لہذا مجبور ہو کے اب یہ تجویز قرار پائی کہ جس

طرح بنے اس کا کام تمام کر دیا جائے۔

”حسین! میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جملہ سنتے ہی میرے دل کی حالت کیا ہوئی، میں لگھرا کے بالکل بے اختیاری کے ساتھ کہہ اٹھی ”تو پھر مجھے بھی مارڈا لو۔“

میری بدحواسی دیکھ کر مرجان بولی ”اگر اس کو بچانا چاہتی ہو تو ایک کام کرو۔ خورشاد کے سامنے چل کر خود ہی اپنی زبان سے سفارش کرو۔“ یہ ایسی بات تھی جس کو میں ہرگز نہ ماننا چاہتی تھی۔ فقط اتنے خیال سے کہ تمہاری جان نپتی ہے، طوعاً و کرہاً گئی۔ اور جب اس نے مسکرا کے مجھ سے بات کرنے کا راہ کیا تو میں نے آہ وزاری کے ساتھ کہا ”خدا کے لیے اس نوجوان کی جان نہ بیجی۔“ میری درخواست سنتے ہی اس نے نہایت متنیں صورت بنائی، مجھے بہت گھور کے غصے کی نگاہ سے دیکھا اور نہایت برہنمی کی آواز میں پوچھنے لگا ”وہ تمہارا کون ہے؟“

میں: وہ میرا عزیز ہے۔ اُسی کے ساتھ کھلائق رہی اور اُسی کے ساتھ پل کے بڑھی ہوئی ہوں، اور اُسی سے میری شادی ہونے والی ہے۔ اسی سبب سے اکیا وہی میری جان و دل کا مالک ہے۔

خورشاد: تمہاری شادی ابھی اُس کے ساتھ نہیں ہوئی؟  
میں نے نظر پیچی کر کے جواب دیا ”نہیں۔“

یہ جواب سن کے خورشاد نے مجھے بدگمانی کی مُختسنس نگاہوں سے دیکھا اور کہا ”مگر شادی سے پہلے ہی تمہارے اُس کے ایسے تعلقات ہو گئے کہ گھر بارچھوڑ کے ساتھ نکل کھڑی ہوئیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ تمہاری عفقت میں داش لگ گیا۔“

”اس کا جواب دیتے وقت مجھے بے انتہا شرم معلوم ہوئی۔ کسی طرح کوئی لفظ میری زبان سے نہیں نکلتا تھا۔ مگر صرف اپنی اور تمہاری آبرو بچانے کی غرض سے میں نے دل کو کڑا کر کے اور بے حیائی

گوارا کر کے جواب دیا۔ میں تو اپنے بھائی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کو اور دوسرے حج کو نکلی تھی۔ مگر ہاں،  
یہ الجتنہ ارادہ تھا کہ قزوین پہنچ کے عقد کر لوں گی۔“

خورشاد: نکاح کی رسم تو قزوین میں ادا ہوتی مگر غالباً تم آپس میں میاں بی بی کے تعلقات پہلے  
ہی قائم کر چکے تھے۔

”اس سوال پر میں اس قد رشر مائی کہ سارا بدن پسند پسند ہو گیا۔ پنجی نظر کر کے بلکہ یوں کہنا چاہیے  
کہ شرم کے مارے آنکھیں بند کر کے جواب دیا۔“ نہیں۔ میری عفت میں فرق نہیں آیا۔“ اتنا سنتے  
ہی خورشاد ایک بے اختیاری کے جوش میں یہ کہتا ہوا میری طرف دوڑا۔“ شکر ہے کہ میری ناز نہیں  
کے پاک جسم کو ابھی کسی کا ہاتھ نہیں لگا۔“ قریب تھا کہ وہ مجھے گلے لگائے مگر میں نے دونوں ہاتھوں  
سے روکا اور اس کے باتحہ سے بچنے کے لیے پاؤں کے پاس زمین پر گر کے کہنے لگی۔“ اس نوجوان  
کی جان نہ لجھیے ورنہ میں مر جاؤں گی۔“ خورشاد دیر تک سوچتا رہا پھر مجھے اٹھا کے بولا۔“ زمر دایہ  
بہت ضروری ہے کہ وادی اُس ضدی شخص سے خالی کی جائے۔“

میں: آہ! میں نے اُسے وصیت کر دی تھی کہ میں مر جاؤں تو گھر کے عزیز ہوں کو میری عفت و  
پاک دامنی کا یقین دلانا۔ مگر افسوس! اس نے نہ مانا۔

”یہ سنتے ہی خورشاد چونک پڑا اور بولا۔“ کیا تم نے اُسے گھر جانے کی وصیت کی تھی؟“  
میں: جی ہاں۔ وصیت کیسی، بہت تاکید و اصرار کے ساتھ کہا تھا۔

خورشاد: تو خیر، کوئی مضائقہ نہیں۔ ایک نہایت عمدہ تدبیر ہے۔ وہ وادی بھی اس سے خالی ہو  
جائے گی اور اسے کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچے گا۔ مگر زمر دایہ سب کچھ صرف تمہاری نظر محبت کی امید پر  
منحصر ہے۔“

اس کے جواب میں کچھ کہنا مجھے بالکل بے موقع معلوم ہوا۔ خاموش لہڑی رہی۔ خورشاد نے قلم و دوات منگا کے ایک خط کا مسودہ لکھا اور اسے میری طرف پڑھا کے کہا ”اے تم اپنے ہاتھ سے صاف کر دو،“ میں نے اسے اس کے سامنے وہیں بیٹھ کے صاف کر دیا۔ میں واپس نہیں آئی تھی کہ ایک دودھہ لانے والی دہکانی کو بلوا کے خورشاد نے وہ خط اس کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ تمہاری غفلت میں قبر پر رکھ دیا جائے۔ یہ میرا پہلا خط تھا۔ میں اس حال کا پہلے بھی بیان کر چکی ہوں۔ مگر پھر کہتی ہوں کہ کیسے کیسے ظلم ہوئے ہیں اور کیسی کیسی مجبوریاں پیش آئی ہیں، جب میں نے تم کو خط لکھا ہے۔

اس خط کے روایہ ہو چکنے کے بعد جب میں واپس آئی تو انہی سے زیادہ حیران تھی۔ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب مجھ سے ما یوس ہو کے تم گھر چلے جاؤ گے۔ روز اسی ادھیرُن میں رہتی تھی کہ تمہاری زبان سے میری موت کا قصہ سن کے اتنا اور ابا کے دل پر کیسی گز ری ہو گی۔ کئی ہفتے اسی حالت میں گزر گئے۔ وہ گورجس کا نام مر جان تھا، روز میرے پاس آئی اور ہمیشہ ہمدردی ظاہر کرتی۔ مگر مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ خورشاد کی سکھائی پڑھائی تھی اور اس سے روز جا جا کے کہہ دیا کرتی تھی کہ میں تمہارے لیے کس قدر حیران رہتی ہوں۔ ایک دن اس نے باتوں باتوں میں پوچھا کہ زمرہ، تمہارا مکان آمل میں ہے؟ میں چونک کے بولی ہاں کیوں؟“

مرجان: وہیں کے ایک زبردست عالم جو فی الحال غیشا پور میں رہتے ہیں، لوگوں کو ہمارے خلاف بہکار ہے ہیں اور اس کو جنتِ فریب بتاتے ہیں۔

میں: کون؟! امام نجم الدین غیشا پوری تو نہیں؟

مرجان: ہاں، وہی۔ ان کے قتل کی تجویز ہو رہی ہے۔

میں: (چونکر) بائے! یہ تو بڑا خلمنہ ہے۔ وہ بڑے باخدا عالم ہیں۔ حسین کے اُستاد ہیں اور انھیں کے وہ مرید ہیں۔

مرجان: (تعجب سے) حسین ان کے شاگرد اور مرید ہیں؟

میں: اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بھتیجے بھی ہیں۔

اس کے بعد میں دل میں افسوس کرتی رہی کہ یہ ظالم نا حق ایک باخدا شخص کی جان لیتے ہیں اور انھی خیالات کی وجہ سے میں نے رات کوئی پریشان اور مہیبِ خواب دیکھے۔ دوسرے دن اُٹھی ہی تھی اور آفتابِ اچھی طرح بلند نہیں ہونے پایا تھا کہ مرجان آئی اور کہنے لگی: ”چلو، زمردا تمھیں خورشاہ نے بُلا�ا ہے۔“

میں: (پریشانی کی صورت بنائے) کیوں؟

مرجان: میں کیا جانوں۔ مگر اتنی وقت چلو۔

محورا میں اُس کے ساتھ گئی اور وہاں جا کے دیکھا کہ وہ تو ایک خوبصورت لڑکی کے ہاتھ سے جامِ شراب پی رہا ہے۔ میری صورت دیکھتے ہی بولا۔

خورشاہ: تم کسی طرح حسین کے خیال کو نہیں چھوڑتیں۔ اگر میری آرزو پوری کرنے کا اقرار کرو تو تمھیں اُس سے ملا دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔

یہ الفاظ سننے ہی میرے دل میں ایک خفیف سی مسرت پیدا ہوئی۔ مگر اُس کی شرط بالکل ایسی تھی جیسے شربت کے جام میں زہر ملا ہوتا ہے۔ میں نے کسی اور خیال کو دل میں دبا کے کہا: ”اگر آپ کے رحم نے مجھے ان سے ملا دیا تو زندگی بھرا وندی رہوں گی۔“

میرے اس جواب سے وہ خوش ہوا اور فوراً ایک دوسرے خط کا مسودہ دے کے کہا: ”اسکو اپنے قلم

سے صاف کر دو۔“ میں نے مسوندہ ہاتھ میں لے کے پڑھا اور خورشاد کی طرف دیکھ کے پوچھا ”  
اب تو حسین اس وادی سے چلے گئے ہوں گے۔“

خورشاد: نہیں۔ اس نے تمہارے خط کی ذرا بھی پرواہ نہیں کی۔ اسی طرح قبر کا مجاور بننا بیٹھا  
بے۔ تم اسے باوفا اور پچا عاشق تصحیح تھیں، مگر وہ تمہاری پرواہ بھی نہیں کرتا۔ اس دل کش وادی  
میں اس کا ایسا دل لگ گیا ہے کہ اب تمہارے حکم کو بھی نہیں مانتا۔

میں: نہیں۔ وہ ایسے ہی باوفا ہیں جیسا کہ میں تصحیح ہوں۔ جس طرح میری جدائی گوارہ نہ تھی  
اسی طرح اب انہیں میری قبر کی مفارقت گوارانہ ہو گی۔

حسین: (جو شہ میں آ کے) بیشک زمر دا صرف اسی خیال سے میں نے تیر احکم نہیں مانا۔

زمرد: خیر، میری زبان سے یہ باتیں سُن کے اس نے ایک حرمت کے ساتھ گھور کے دیکھا اور کسی  
قدر پست آواز میں بولا۔ یہ مسوندہ جلدی صاف کر دو کہ وہ تم سے ملنے کا سامان کرے، مجھے اس  
سوڈے کے پڑھتے ہی حرمت ہو گئی۔ پڑھتی جاتی اور دل میں کہتی جاتی تھی کہ یہ لوگ کس قدر مغار  
اور فربی ہیں۔ بہر حال، میں نے خط صاف کر کے دے دیا اور چلی آئی۔ دوسرے دن مجھے مر جان  
کی زبانی معلوم ہوا کہ وہ خط تمہارے پاس بھیج دیا گیا اور اس سے یہ غرض تھی کہ تمھیں شیخ علی  
وجودی کا معتقد بنائے انجی کے ذریعے سے امام نجم الدین نیشا پوری تمہارے ہاتھ سے قتل کرائے  
جائیں۔ اس سلے میں تم جنت کی سیر کرو اور مجھے تم سے ملنے کا موقع ملے۔ حسین! کیا کہوں۔ یہ  
معلوم ہوتے ہی میں نے اپنے اوپر کتنی لعنت ملامت کی۔ دل میں ڈرتی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ  
میری وجہ سے تم ان کے خون میں اپنے ہاتھ رنگ لو۔ دعا کرتی تھی کہ خدا کرے پہلے خط کی طرح تم  
اس خط پر بھی عمل نہ کرو۔ مگر جب معلوم ہوا کہ یہاں کے بھیجے ہوئے گدھے پرسوار ہو کے تم روانہ

ہو گئے تو دل میں اور ڈرمی اور دعا کرنے لگی کہ خداوند! حسین کو اس گناہ سے بچا۔ مگر بعد مذکور کے پھندوں میں پھنس گئے ہو۔ جب تم اُس وادی کو چھوڑ کے چلے گئے تو یہاں کی جوریں اکثر اوقات سیر و تفریح کی غرض سے وہاں جانے لگیں، جن کے ساتھ خورشاد کی اجازت سے میں بھی کبھی چلی جاتی تھی اور اپنی قبر کو دیکھ کے تمہارے خیال سے اکثر ہی دل میں روئی تھی۔

جب تم جنت میں آئے، اس سے پہلے مجھے بتا دیا گیا کہ تم سے کیوں کر ملوں، کس قسم کی باتیں کروں اور تمہارے اعتقاد کو کس طرح بڑھاؤں۔ امید تھی کی اس کے ذریعہ خلاف ہوا اور ذرا سا بھی راز تم پر ظاہر ہو گیا تو تم سے پہلے میں مارڈا لی جاؤں گی۔ پھر ہر وقت یہاں میری اور تمہاری نگرانی ہوتی رہتی تھی اور مجھے تم سے ایک لفظ بھی کہنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اس کے علاوہ مجھے تمہاری یہ حالت نظر آئی کہ جیسے تم پر کوئی جادو چلا ہوا تھا اور اپنے ہر نیک و بد سے بے خبر تھے۔ ایسی حالت میں اس کی امید نہ تھی کہ تم سے کچھ کہوں گی تو تم اُسے ضبط کر کے چھپا سکو گے۔ اسی خیال سے میں نے کچھ نہ کہا۔ تاہم موقع پا کے اتنا بتا دیا تھا کہ نہ امیدی کی حالت میں میری قبر پر آنا اور آخر اسی تدبیر سے خدا نے کامیاب کیا۔ مگر حسین! میں نے خورشاد کے ہاتھ سے تمہارے لیے بڑے بڑے ظلم اٹھائے۔ برائے نام اس جنت میں تھی۔ تمہارے جانے کے بعد اور زیادہ سختیاں ہوئیں۔ اب خورشاد کو خیال ہو چکا تھا کہ میں کبھی اس کے موافق نہ ہوں گی۔ مگر لوگوں کے کہنے سننے اور اس کے دلی میلان کا نتیجہ تھا کہ اس وقت تک زندہ ہوں۔

حسین: (زمرد کو گلے لگا کر) نیمت ہے کہ اتنی مصیبتوں کے بعد ہم پھر مل گئے۔ مگر اب مجھے ضرورت ہے کہ ان ظالموں سے ان باتوں کا انتقام بھی لوں۔ جب تک انتقام نہ لوں گا

تب تک چیز سے بیٹھنا نصیب نہ ہو گا۔ میرے گناہوں کا فارہ یہی ہے کہ دنیا کو خورشاہ، علی و جودی اور طورِ معنی اُکی نجاست سے پاک کروں۔ جس طرح ابھی ان لوگوں کا فدائی تھا، اب دین کا سچا فدائی رہوں گا۔ ان کے مستقر پر جاؤں گا اور اسی بہانے سے ان لوگوں کو جنت کی بجائے دوزخ میں بھیجنوں گا۔

زمرد: تمہیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ فی الحال عید قائم قیامت ہے۔ یہ سب لوگ یہیں آئے ہوئے ہیں۔ اسی قلعے میں موجود ہیں۔ اور ان کی سزا وہی کا بھی پورا انتظام ہو گیا ہے۔ آن ہی شام تک تمہیں موقع عمل جائے گا کہ شہزادی بلغان خاتون کے ساتھ خورشاہ کے محل میں اور قلعے میں گھس کے ایک ہی وقت تینوں کا کام تمام کرو۔

حسین: زمردا تجھے یہاں کے حالات کیونکر معلوم ہو گئے؟

زمرد: خوروں اور جنت والوں سے کوئی راز پھپھا تھوڑا ہی ہے۔ مرجان کی طرح یہاں کی بعض خوریں خورشاہ کے محل میں جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک دوسر وقت اس کی صحبت میں موجود رہتی ہیں۔ یہ خوریں جب واپس آتی ہیں تو جو کچھ دیکھتی سنتی ہیں، دوسروں سے کہہ دیتی ہیں۔ اس طرح تھوڑی دیر میں ہر بات سب میں مشہور ہو جاتی ہے اور کسی نہ کسی ذریعے سے میں بھی سن لیتی ہوں۔ اور ہاں حسین! یہ تو بتاؤ کہ شہزادی کے ساتھ فون کتنی ہے؟

حسین: فون؟ تھوڑے سے جوان ہوں گے۔

ناگہاں ایک شورا اور ہنگامے کی آواز بلند ہوئی۔ دونوں گھبرا کے محل سے باہر نکل آئے اور سپاہیوں کا عظیم الشان لشکر دیکھ کے اس کے محل کی طرف دوڑے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔

## انتقام

حسین اور زمرد نے اپنے قصر سے نکل کے دیکھا تو عجب عالم نظر آیا۔ جنت کے آرام واطمینان میں فرق آ گیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گویا فردوس بریں میں قیامت آ گئی ہے۔ خوبصورت پری چہرہ ہور و غلامان جو اپنے حسن و جمال سے ہر ایک کونورانی پیکر ہونے کا دھوکہ دیتے تھے، قصر وں اور کوشکوں سے نکل نکل کے بد حواس بھاگے اور ایک دوسرے کی آڑ میں چھپنے لگے۔ ہر طرف تھملکہ پڑ گیا۔ جہاں رونا حرام بتایا جاتا تھا، وہیں ہر طرف روئے پہنچنے اور نوحہ و بکا کی آواز باندھوئی۔ ایک عظیم الشان اور بڑا بھاری تاتاری لشکر جنت میں داخل ہو گیا تھا، جس کے سپاہی ہر چہار طرف پھیلتے جاتے تھے۔ قصر وں اور کوشکوں میں لوٹ مارچ گئی تھی۔ خوبصورت لڑکیاں اور پری جمال لڑکے گرفتار ہو رہے تھے، جن کی کہی ہوئی صورتوں اور چین و پکار کی آوازوں سے عجیب نازک گھٹری کا سماں پیدا ہو رہا تھا۔ یہ وحشت انگیز اور بد حواس کرنے والا سماں دیکھتے ہی زمرد شہزادی کی آرام گاہ ہوئے اس کوشک میں پہنچے جہاں شہزادی بلغان خاتون آرام کر رہی تھی۔ زمرد شہزادی کی آرام گاہ کے قریب پہنچ کے دستک دینے کو ہی تھی کہ ایک وحشی اور غارت گرتاتاری اُس کی طرف جھپٹ پڑا۔ حسین کے پاس کوئی ہتھیار تو نہ تھا، وہ اپنی فدا بیت کا خیبر لے کے دوڑا۔ قریب تھا کہ اُس میں اور تاتاری میں لڑائی ہو جائے کہاں کمرے کا دروازہ گھلا اور خوبصورت شہزادی بلغان خاتون اپنے بکھرے ہوئے اور لشکر کے ساتھ باہر نکلی اور تاتاری زبان میں چلا کے بولی ”**ٹھہرو!**“ شہزادی کی صورت دیکھتے ہی تاتاری دوڑ کے اس کے قدموں پر گر پڑا اور عرض کیا کہ ہم حضور کی تباش میں تھے۔

شہزادی: تم میرے ساتھ والوں میں سے ہو؟

تاتاری: نہیں۔

شہزادی: (خوش ہو کے) بھائی آگئے؟

تاتاری: جی ہاں۔

ناگہاں تاتاریوں کا ایک بڑا غول نظر آیا جن کے درمیان میں خود ہلاکو خان بھی موجود تھا۔ شمشیر برد ہنس اس کے ہاتھ میں تھی۔ ہلاکو خان کو آتے دیکھ کے بلغان خاتون استقبال کو دوڑی۔ بہن بھائی جوش و خروش اور گرم جوشی سے ملے۔ وحشی اور عارٹ گر جوانوں نے ایک گھڑی کے لیے مہڈ ببن کے اور مرثب ہو کے اپنی حسین و ناز نیں شہزادی کو سلام کیا اور ہر طرف سے خوشی و مشرت کے نعرے باندھ ہونے لگے۔

بلغان خاتون: (ہلاکو خان سے) بھائی۔ آپ کب آئے؟ مجھے تو تردد ہو چا جاتا تھا۔

ہلاکو خان: تم کہتیں اور میں نہ آتا؟ اس میں شک نہیں کہ اس وقت سلطان و پیغم کے تعاقب میں عجلت کرنے کی ضرورت تھی مگر تمہارا خط دیکھتے ہی مجبور ہونا پڑا۔ میں نے تھوڑی سی فون اس کے تعاقب میں چھوڑ دی اور باقی لوگوں کو ساتھ لے کے چا آیا۔

بلغان خاتون: میں روانہ ہونے سے کئی دن پہلے آپ کو اطلاع دے پکھی تھی۔ اسی خیال سے زیادہ فون اپنے ہمراہ نہیں لائی۔ لیکن آج صح جو آپ کے پہنچنے میں دیر ہوئی تو میرا تردد بڑھتا جا رہا تھا۔

ہلاکو خان: میں نے بہت کوشش کی کہ صح تر کے پہنچ جاؤں مگر کسی طرح نہ پہنچ سکا۔ خیر، اب بھی چند اس دیر نہیں ہوئی۔

اس کے بعد بلغان خاتون نے زمر دا اور حسین کو ہلاکو خان کے قدموں پر گرا یا اور کہا ”یہی وہ لوگ ہیں جن کی مدد سے میں یہاں تک آ سکی۔“ ہلاکو خان نے انھیں اٹھا کے گلے سے لگایا اور کہا ”اپنی بہن کی طرف سے میں بھی شکر گزار ہوں۔“

دونوں نے جھک کے اس کے قدم چومنے اور کہا ”حضور ہی کی توجہ سے ہم کو اس قید خانے سے نجات ملی ورنہ زندگی بھرن جاتی کی کوئی امید نہ تھی۔“

بلغان خاتون: اور بھائی! آپ کے ہمراہ کتنی فونج ہے؟

ہلاکو خان: میں پچاس ہزار فونج لے کے چاہتا ہم راستے میں وہ چالیس ہزار جوان اور خدا مل گئے

جو تمہارے ساتھ آئے تھے۔ اب گل نوے ہزار تاتاری میرے ہمراہ ہیں۔ مگر ان میں سے صرف پانچ ہزار آدمی اندر لا یا ہوں۔ اس لیے کہ راستے کی دشواریوں کے باعث اس سے زیادہ فونج کا یہاں لانا غیر ممکن تھا۔

بلغان خاتون: اور باقی ماندہ فونج نہر کے کنارے پڑی ہوگی۔

ہلاکو خان: نہیں۔ میں نے کئی منزل پیشتر سے اپنی فونج کے چالیس ہزار آدمی قاعدہ الموت پر پہنچ دیے تھے جو آج ہی پہنچ گئے ہوں گے اور قلعے کے اندر سے ہماری طبل و قرنا کی آواز سنتے ہی یورش کریں گے۔ نہر ویرنجان کے کنارے پہنچ کے جب معلوم ہوا کہ زیادہ آدمی یہاں تک نہیں پہنچ سکتے تو میں نے طوبی خان کو باقی ماندہ فونج کا سردار مقرر کر کے حکم دیا کہ وہ بھی الموت ہی پر جا کے حملہ کرے۔ اس کے ساتھ ۲۵ ہزار فونج ہے۔ مجھے خدا شر تھا کہ یہ لوگ وقت پر نہ پہنچ سکیں گے۔ مگر اتفاقاً خوش قسمتی سے ایک یہیں کا کوہستانی شخص مل گیا جس نے بتایا کہ الموت بہت قریب ہے۔

زیادہ سے زیادہ پانچ گھنٹے میں پورا شکر وہاں پہنچ سکتا ہے۔ طوبی خان اُس شخص کو ساتھ لے کے گیا ہے اور یقین ہے کہ تھوڑی ہی دیر میں وہ بھی قافعے کے چالک پر پہنچ گیا ہو گا۔ خیریہ بتاؤ کہ قافعے کا راستہ کہا ہے؟

بلغان خاتون: تو بھائی تھوڑی دیر پھر کے ستاوے، پھر چلنا۔ تم ابھی منزل مارے اور تھکے ماندے چلے آ رہے ہو۔

ہلاکو خان: (ہنس کے) ہمارا آرام اسی میں ہے کہ جو ہر شجاعت دکھانے کوئی اچھا میدان جنگ ملے۔ جب تک فتح حاصل نہ ہو لے، اس وقت تک کوئی چیز ہماری تھکان کو نہیں مٹا سکتی۔ ہاں البتہ تمہارے تھکنے کا مجھے لحاظ ہوتا۔ مگر تم مجھ سے پہلے ہی یہاں پہنچ چکی ہوا اور اچھی طرح ستا چکی ہو۔ لہذا اب کسی بات کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں۔

حسین: (جو شوش و خروش سے قدم آگئے بڑھا کے) حضور بے شک انتظار نہ کرنا چاہیے۔ مجھے ان لوگوں نے اتنا فریب دیا ہے اور میرے ہاتھ سے ایسے گناہ کرائے ہیں کہ جب تک ان میں سے خاص تین شخصوں کی جان نہ لے لوں گا، چین نہ پڑے گا۔ ہر وقت میرے دل سے انتقام کی آواز نکلتی ہے۔ پریشان ہوا جاتا ہوں۔

ہلاکو خان: (مسکر کے) ہاں، ذرا بیان تو کرو کہ تمہیں کیوں فریب دیا گیا تھا؟  
شاہی حکم کی تعمیل میں حسین نے اپنی سرگزشت منحصر الفاظ میں بیان کی اور آخر میں آبدیدہ ہو کہ کہنے لگا "افسوس! از مرد کی محبت کے نام سے اتنے بڑے اور ایسے فریب دیے گئے ہیں کہ جب تک زندہ ہوں اپنے اوپر لعنت کروں گا۔

ہلاکو خان: (حیرت سے) واقعی، ان لوگوں نے دنیا کو مکاری اور ریا کاری کا عجب جال ڈال رکھا

بے اب اس قلعے کی فتح کے بعد میرا ارادہ ہے کہ ملائکہ کی نجاست سے ساری دنیا کو پاک کر دوں

حسین: اگر ایسا ہوا تو خدا تعالیٰ آپ سے بہت خوش ہو گا اور دنیا ہمیشہ کے لیے آپ کے مبارک  
اسلحہ کی ممنون احسان رہے گی۔

ہلاکو خان: تو چلو۔ اب تاخیر میں نقصان ہے۔ ہماری فون جو قلعہ کے گرد تھہری ہوئی ہے متعددو  
پر پیشان ہو گی۔

زمرد: یہ کام میرے ذمے ہے، حضور! آپ کی اس لوگوں کے سوا کوئی اس راستے سے واقف  
نہیں ہے۔ مگر اپنے ہمراہ یوں کو حکم دیجیے کہ جب تک محل کے اندر نہ داخل ہو لیں، نہایت خاموشی  
سے چلیں۔ پہلے سے خبر ہو گئی تو محل سرائے کا چھانک بند کر لیا جائے گا اور پھر قلعے کی طرف جانے  
میں بڑی بڑی دشواریاں پیش آئیں گی۔

زمرد کی ہدایت کے مطابق ہلاکو خان نے اپنے تمام ساتھیوں کو ساکت و صامت اور آہستہ قدم  
انٹھانے کا حکم دیا۔ وہ پانچ سوتا تاری جو قراقرم سے شہزادی کے ہمراہ آگئے تھے اور اب اس پانچ  
ہزار فون کے بعد وہ جنت کے اندر داخل ہو گئے تھے، وہی جنت میں چھوڑ دیے گئے تاکہ اسی روشنی  
خور غلام کی حفاظت کریں۔ ہلاکو خان الموت کے قصر شاہی کی طرف اس شان سے روانہ ہوا کہ  
آگے آگے حسین تھا۔ اب اسے کسی تاثری جوان سے ایک تلوار مل گئی تھی، جسے وہ غضب اور انتقام  
کے ارادے سے علم کیے ہوئے تھے۔ اس کے پیچھے خود ہلاکو خان تھا جس کی دہنی طرف بلغان  
خاتون تھی اور با نیں طرف زمرد تھی اور ان کے پیچھے پانچ ہزار تاریوں کا غول تھا، جو باوجود از و  
حام و جوش و خروش کے نہایت ہی سکوت و متناثت کے ساتھ آہستہ آہستہ آگے بڑھتا چاہتا تھا۔

نہر ویرنجان کے اس طرف تمام چمن اور دل کش قطعاتِ باغ طے کر کے یہ پُر سکوت گروہ شہری پُل پر پہنچا۔ زمرد نے بڑا ہر کپڑا کا قفل کھوا۔ آج صحیح ہی کو راستہ روکنے کے لیے اس پُل میں قفل ڈال دیا گیا تھا۔ پُل کا پچانک کھاتے ہی سب نہر سے اُتر اُتر کے ایک پُر فضا اور دل کش مرغزار میں داخل ہوئے اور زمرد کے بتانے کے موافق ایک خوش نما اور خوش گوار راستے سے گزر کر بڑے بڑے سمایہ دار درختوں کے ایک جھنڈ میں پہنچے۔ انھیں درختوں کے گھونگھٹ میں رکن الدین خور شاہ کے محل سرا کا خوبصورت دروازہ چھپا ہوا تھا۔ دروازے کی صورت دیکھتے ہی یہ لوگ دوڑ کے اندر گھس گئے اور قبل اس کے کہ کسی کو خبر ہو، ایک طوافی ڈیوڑھی کو قطع کر کے خوش نما اور فرحت بخش خانہ باغ میں جا پہنچے جوانی شادابی اور دلکشی میں الہوت کی جنت سے کم نہ تھا۔

ان خلل اندازوں کی صورت دیکھتے ہی چند سپاہی جو پہرے پر متعین تھے، اپنا اسلوے کے دوڑے مگر جب دیکھا کہ تاتاریوں کا ایک لشکر ہے تو وہ بد حواس بھاگے۔ دو چار مارے گئے اور بقیہ اسیف نے بھاگ کے سارے محل اور قلعے میں ہل چل ڈال دی۔ قلعے میں مذہبی عید کی رسیں بجا لائی جا رہی تھیں اور بیر ونی اور نیز یہاں کے لوگوں کا بڑا بھاری مجمع تھا۔ اگر حواس سے کام لیا جاتا تو ممکن تھا ایک معمر کے کی لڑائی ہوتی۔ مگر تاتاریوں کی ہیبت ان دنوں ساری دنیا میں بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے قلعے میں داخل ہو جانے کا سنتہ ہی سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ خود خور شاہ جو کھڑا ڈھپہ پڑھرہا تھا، ممبر سے اُتر کر بد حواس بھاگا کہ کسی کونے میں جا چکے۔ مگر جانے نہ پایا تھا کہ محل کی نازک انداام اور پری جمال عورتیں برہنہ پا بھاگ بھاگ کے آتیں اور قدم پر اس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتی تھیں۔ اس وقت یہاں اس کی خبر نہ تھی کہ قلعے کے گرد سے بھی ایک بڑا بھاری اور عظیم تاتاری لشکر محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ باادشاہ اور مُعتقدوں کو بد حواس دیکھ کے تمام سپاہی اور

اہل قلعہ، داعی اور فدائی قلعے کے پھانک کھول کے بزدلی اور خوف کی آوازیں بلند کرتے ہوئے باہر نکلے، جن کے نکتے ہی قلعے کے اندر مغلی طبل اور قرنا بھی اور تاتاریوں کے باہر والے تاتاری لشکر نے قومی باجوں کی آواز سنتے ہی خود اپنا طبل بجا کیا اور فوراً حملہ کر دیا۔ بھاگ کے باہر جانے والے، تاتاری لشکر کے مُتعلِّم سمندر کو ایک طوفان کی طرح اپنی طرف آتے دیکھ کر نہایت ہی از خود رشگی کے ساتھ اٹھ لئے پھرے، جن کا طوبی خان کے لشکر نے بڑی پھرتی سے تعاقب کیا اور باہر کے جان بازوں کو قتل کرتے ہوئے قلعے کے اندر گھس پڑے۔

اب قلعے کے اندر سخت طوفان بیا تھا۔ ہر طرف قتل عام کا سامان نظر آ رہا تھا۔ بوڑھے بچے، زن و مرد، اہل حرفا اور سپاہی سب بلا استھنا اور امتیاز قتل ہو رہے تھے۔ ایک عجیب ہنگامہ تھا جس میں تیرا در نیزے، تلوار اور چھری اور گرز اور تبر کی ہولناک آوازوں کے ساتھ تاتاری لشکروں کی وحشت ناک چینیں، ہجورتوں اور بچوں کی آہوز ارمی اور روئے نے پیٹنے کی آوازیں ایک ساتھ سنی جاتی تھیں۔

ہلاکو خان اور بالغان خاتون کے ہمراہی خور شاہ کے محل میں ایک ایک دلان میں گھس کے خونزدہ عورتوں، مردوں بوڑھوں اور بچوں کو نکال نکال کے ہنکاتے ہوئے اُس بڑے میدان میں لائے جس جگہ چند منٹ پہلے عید کا جشن ہو رہا تھا اور عیش و مُسرت کے پُر جوش نعرے بلند ہو رہے تھے۔

دوسری طرف سے بھاگنے والوں کو طوبی خان کے ہمراہیوں نے نہایت ہی بدحواسی کے ساتھ ہنکا کے اندر کیا۔ وہ بھی اسی میدان میں آ کے مظلوم و پریشان حال دوستوں سے انہوں کی طرح ٹکرانے لگے۔ کسی کو اپنے پرائے کا ہوش نہ تھا۔ ہر شخص کے حواس غائب تھے۔ اور دشمن میں سے کسی کو پاتا تھا، مجنون یا ذوبنے والوں کی طرح اُس کے دامن سے لپٹ کے پناہ مانگتا۔ یہ دل خراش منظر زمرد کے دل پر نہایت ہی اثر کر رہا تھا۔ وہ ان لوگوں کی بے کسی دیکھ کے روائحتی تھی۔

کئی مرتبہ قافعے کی بعض ستم زدہ عورتوں کے ساتھ اس کی زبان سے بھی جنح کی آواز نکل گئی۔ زمرد کی پریشانی دیکھ کے باغان خاتون اس کے قریب آئی اور کہنے لگی ”زمرد! میں جانتی کہ تمہارا دل اس قدر کمزور ہے تو تم کو یہاں ہرگز نہ لاتی۔“

زمرد: (روکے) شہزادی، یہ سب میرا کیا ہوا ہے۔ جو خون کا قطرہ اس وقت قافعے میں گر رہا ہے اور گرے گا، اس کے گناہ میں میرا نام بھی لکھا جائے گا۔ اور ممکن نہیں کہ اس کے انتقام سے نج سکوں

باغان خاتون: یہ صرف تمہارے دل کا بودا پن ہے ورنہ ان لوگوں کا قتل کرنا گناہ نہیں۔ ذرا یہ تو خیال کرو کہ اس وقت ہم کیسے کیسے مقدس بزرگوں اور نامور لوگوں کا بدلہ لے رہے ہیں۔ جتنے لوگ یہاں مارے جائیں گے، ان سے زیادہ رو جیس اس وقت خوش ہو رہی ہوں گی اور ہمارے لیے خدا سے مغفرت کی خواست گار ہوں گی۔

زمرد: (بچکیاں لے کے) جو کچھ بھی ہو مگر شہزادی مجھ سے یہ ظلم و جور نہیں دیکھا جاتا۔  
باغان خاتون: جب یہ ظلم و جور دل پر اثر کرے تو ان مظالم کو یاد کرو جو ان ظامنوں کے ہاتھوں دنیا پر ہوتے رہے ہیں۔

چھوڑی ہی دیر میں قافعے کی نصف سے زیادہ آبادی قتل ہو گئی۔ اشیں ہر طرف تڑپ رہی تھیں۔ ہر طرف سے پھر کتی ہوئی آئیں، ایک مقام پر بہت سی جمع ہو جاتیں اور ایک دوسری کو ماتینیں اور باہم لپٹ لپٹ کے اچھلتی تھیں۔ مگر قاتلوں کا خیال بھی اس طرف نہ جاتا تھا۔ وہ برادر بے سر دھڑوں کو کر اگر اسکے انھیں تڑپتی ہوئی اشوں کے تو دوں کی طرف بڑھا رہے تھے۔

اب ہلا کو خان اسی ممبر پر کھڑا تھا جس سے خورشاد جعلیے کو نا تمام چھوڑ کے اُتراتھا۔ برہنہ و خون آ لو د

تلوار اس کے پاتھ میں تھی۔ اور اس کی بہن شہزادی بلغان ممبر کے نیچے اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ حسین اگر چہ فوجی آدمی نہ تھا۔ مگر اسے انتقام کا پورا موقع مان تھا اور دل کی آگ ملاحدہ کے قتل کی پیاس کو تیز کر رہی تھی۔ تا تاریوں کی بھیڑ میں گھس گھس کے وہ ان خاص لوگوں کو ڈھونڈتا پھرتا تھا جنہیں اس نے پہلے سے اپنا شکار تجویز کر لیا تھا۔ ناگہاں ایک شخص دوڑ کے اس کے دامن سے پیٹ گیا اور اس کے منہ سے آواز نکلی:

”حسین مجھے بچا۔ میں جانتا ہوں کہ تو شجرِ معرفت کی ایک شاخ ہے۔“ حسین سمجھ گیا کہ یہ کاظم جنوبی ہے۔ دل میں آئی کہ ایک ہی وار میں اس کا سر اڑا دے مگر خود ہی سوچا کہ اس سے طورِ معنی اور علی وجودی کا پتا لگ جائے گا۔ یہ خیال آتے ہی ذرا دوستی کی شان سے کاظم جنوبی کی طرف جھک کے پہ چھا ”طورِ معنی کہاں ہے؟“

کاظم جنوبی نے یہ الفاظ سنتے ہی سر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا اور ایک شکستہ حال پڈھے کی طرف جو کئی آدمیوں کے درمیان زمین پر ننگے سر بیٹھا تھا، اشارہ کیا اور پھر زمین پر گر کے کہنے لگا اے شجرِ معرفت! مجھے پناہ دے۔“ حسین نے غصب آؤ دیوروں سے اس کی ذلیل خوشنامد کو دیکھا اور یہ کہہ کر کہ ججھ جیسے ذلیل فربتی کے لیے پناہ نہیں ہے، اس کا سر اڑا دیا۔

کاظم جنوبی کو تڑپتا چھوڑ کے وہ اس پڈھے کی طرف گیا اور دیر میں بچان سکا کہ طورِ معنی اور ہی ہے۔ حسین نے اس مجمع کے اندر باتھ ڈال کے اسے باہر کھینچا اور کہا ”آن تو میں نے متبرہار جواب خود ہی چاک کر ڈالے اور طورِ سینا کو بے جواب دیکھ رہا ہوں۔“ یہ جملہ سنتے ہی طورِ معنی نے حیرت و استعجاب سے حسین کی طرف دیکھا اور کہا ”اے نوجوان! تو کون ہے کہ مردِ حقیقت سے آگاہ معلوم ہوتا ہے؟“

حسین: ہاں، خوب آگاہ ہوں۔ مگر آپ نے شاید مجھے نہیں پہچانا؟  
طورِ معنی: نہیں، بالکل نہیں۔

یہ جواب سنتے ہی غصے میں آ کے حسین نے اس کے منه پر تھوک دیا اور کہا "یا تو وہ کشف تھا کہ بغیر اسکے کہ میری صورت دیکھئے اور میری آواز سُنئے تو نے کہا تھا، اے نوجوان آمی، مر جبا۔ یا آج مجھے دیکھ کے بھی نہیں پہچان سکا؟ تیری سب سازشیں گھل گئی ہیں اور معلوم ہو گیا کہ تو کتنا بڑا مکار و بد معاش ہے۔" اس جواب پر طورِ معنی جھک کر حسین کے قدم پُھو منے لگا اور رُفت و بد حواسی کی آواز میں بولا "رحم، جوان آمی۔"

حسین: ہرگز نہیں۔ تو ایک فتنہ ہے جس سے دنیا کو جہاں تک ہو سکے جلد خالی کرنا چاہیے۔  
یہ کہہ کر حسین طورِ معنی کے سینے پر چڑھ بیٹھا، تلوار زمین پر ڈال دی اور کمر سے خنجر نکال کے بولا "یہی وہ فدائیت کا خنجر ہے جو میری کمر میں بندھوا یا گیا تھا۔ اسی سے میں نے امام ناصر الدین احمد کے سے نیک نفس بزرگ کی جان لی تھی، اور اسی سے تیرانا پاک سینہ چاک کرنا چاہتا ہوں۔" طورِ معنی پچھے کہنے کو تھا کہ حسین کا خنجر اس کے سینے میں اتر گیا اور ایک ہی وار میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ایک آہ کے ساتھ جان دے دی۔ حسین اپنی تلوار لے کے اٹھ کھڑا ہوا، مگر اچھی طرح لکھڑا نہیں پایا تھا کہ دیکھا کہ کس قدر فاصلے پر ہلاکو خان کے قریب ہی ایک تاتاری ایک ضعیف العمر بڑھے کو اس کے عما مے سے بامدھ کر کھینچ رہا ہے۔ حسین اسے دیکھتے ہی پہچان گیا کہ علی وجودی ہے۔ بے اختیار دوڑ اور گپڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کے چلا یا "یہ میرا مجرم ہے۔"

تاتاری: کیوں؟ اگر فقار میں نے کیا اور مجرم ثمھارا ہو گیا؟

حسین: ہاں! اس لیے کہ یہ میرا قدیمی مجرم ہے۔

اس چمٹے کے ساتھ ہی بلا کو خان نے اس تاتاری کو اشارہ کیا کہ اس قیدی کو حسین ہی کے سپر دکر دے۔ حسین نے علی وجودی کو اسی طرح اس کے عما مے کا ایک جھپکا دے کے دریافت کیا ”مجھے پہچانا!“

علی وجودی کچھ ایسی مایوسی اور از خود فٹگی کی حالت میں تھا کہ اس وقت اس نے دیکھا ہی نہ تھا کہ اس کے سر پر کیا گدری ہے اور کس کے ہاتھ میں گرفتار ہے۔ حسین کی آواز سن کے اس نے سر اٹھایا اور پہچانتے ہی چلا اٹھا ”آہا! حسین! مجھے تیری جستجو تھی۔ جب قاعده الموت سے تیرے نکالے جانے کی خبر معلوم ہوئی تو مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ افسوس! اگر تو میرے پاس آ جاتا تو اس طرح ناکام نہ رہتا۔

دراصل علی وجودی یہ نہیں سمجھا تھا کہ حسین اب اس کے عقائد کے خلاف ہے۔ اسے خیال گزرا کہ اب تک یہ میرا معتقد ہے اور اسی وجہ سے مجھے تاتاریوں سے پھرفا کے بڑی دلیری اور بہادری سے بیہاں لایا ہے۔

حسین: (عقیدت کی شان اور عما مے کا سراچھوڑ کے) مگر آپ کو تو غیب کی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ آپ نے سیر لا ہوتی میں بے شک دریافت کر لیا ہو گا کہ میں کن پہاڑوں اور کن گھاٹیوں میں سر گکراتا پھرتا تھا۔

یہ سون کے علی وجودی نے حسین کو بدگمانی کی نظر سے دیکھا اور کہا ”سیر لا ہوتی اسی وقت ہوتی ہے جب انسان توجہ قلبی سے کام لے۔“ دراصل میں نے تیرا حال دریافت کرنے کی جانب کجھی توجہ نہیں کی تھی۔

حسین: مگر یہ امید نہ تھی کہ مجھ سے عقیدت کیش کو آپ بالکل چھوڑ دیں گے۔

علی وجودی: او حسین! یہ فتنہ کیوں کر بپا ہوا؟ یقین بے کہ تجھے معلوم ہو گا، اس لیے کہ تیرے کہنے سے تاتاریوں نے میری جان چھوڑ دی۔

حسین: آپ کو پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ کو ہر امر واقعہ اُنی تو بجز قلبی سے معلوم ہو جاتا ہے۔

علی وجودی: اتنا جانے پر بھی تو عالمِ ارواح کے رموز سے نآشنا ہے۔ جن لوگوں کو ان رموز میں مکال حاصل ہوتا ہے، انھیں کبھی اپنی خبر نہیں رہتی۔ سنا نہیں:

گہے بر طارِ مائل نشیم

گہے بر پشت پائے خود نہ نشیم

حسین: رُکن الدین خورشاد نے مجھے جنت میں بھینے سے انکار کیا اور اپنے قلعے سے نکلا دیا جس کے بعد مایوس تھی اور عجیب بے کسی کی حالت میں تھا۔ افسوس! اس وقت آپ نے خبر نہ لی۔ مگر معاملہ دگر گوں ہونے والا تھا۔ تقدیر نے مجھے ایک اور شخص سے ملا دیا اور اب اس کی برکت و رہبری سے جنت میں پہنچا اور زمرہ سے ہام کناری نصیب ہوئی۔ افسوس! کہا ب میں آپ کے مریدوں سے نکل گیا اور اس کے مریدوں اور معتقدوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

علی وجودی: وہ کون شخص ہے؟

حسین: تاتاریوں کا سردار ہلاکو خان۔ اور اس کی شرائط حسب ذیل ہیں۔

علی وجودی نے یہ سُننے ہی سر سے پاؤں تک کانپ کے حسین کی صورت دیکھی اور پوچھا: ”وہ شرائط کیا ہیں؟“

حسین: وہ یہ کہ آپ جیسے جتنے مغار اور سیہ کا رمل احمدہ ملیں، ان کا سرت سن سے جدا کر دوں۔

علی وجودی: (سمم کے) اور ایسے ظالمانہ احکام بجالانے میں تمھیں تامل نہیں؟  
حسین: بالکل نہیں۔ اس سبق تو آپ ہی سے مل چکا ہے کہ مرید کو مرشد کے ہاتھ میں ایک  
بے جان آئے کی طرح رہنا چاہیے۔ ہر ظاہر کا ایک باطن ہے اور اس کا باطن میرے  
مرشد کے نزدیک بہت ہی اچھا اور حدا کی درگاہ میں مقبول ہے۔

علی وجودی نے شرم کے اور سر جھکایا اور کہا ”مگر جو کچھ بھی ہو، تمھیں رحم سے کام لینا چاہیے۔“  
اس جواب سے حسین کو بہت غصہ آیا مگر اس نے ضبط کر کے اپنے تیس روکا اور کہا ”بے شک ظلم خدا  
کو پسند نہیں ہے اور اتنی وجہ سے امام نجم الدین غیثا پوری کی روح آن تک پکار پکار کے کہہ رہی  
ہے کہ میرا خون علی وجودی کی گردن پر ہے۔“ یہ سنتے ہی علی وجودی سر سے پاؤں تک کاپنے لگا اور  
تحوڑی دیر بعد جب اس کے دل کو ذرا سکون ہوا تو بولا ”مگر میرے تمہارے ساتھ ایسے تعلقات رہ  
چکے ہیں کہ مجھے تم سے بے رحمی کی امید نہیں۔“

حسین: امام نجم الدین غیثا پوری سے زیادہ مجھے آپ سے تعلق نہیں رہا ہے۔ وہ میرے پچھا تھے  
اُستاد تھے، مرشد تھے۔

اب علی وجودی کو خوف نے اس کے اختیار سے باہر کر دیا۔ وہ ایک دفعہ روتا ہوا حسین کے قدموں پر  
گرا اور چلا یا ”رحم رحم !!“

حسین: ہرگز نہیں۔ ہزار بار پاک اور مقدس روح میں فریاد کر رہی ہیں جو یقیناً اب تمہاری نظر  
کے سامنے ہوں گی اور تمھیں چاروں طرف سے دھمکا رہی ہوں گی۔

اور بے شک علی وجودی کی اس وقت یہی حالت تھی۔ وہ بار بار چاروں طرف گھبرا گھرا کے دیکھتا  
تھا اور ہر طرف اُسے کوئی مظلوم تصویر پھر یوں اور خبروں سے دھمکاتی ہوئی نظر آتی تھی۔ عین اسی

حالت میں جب اس کے چاروں طرف پھر یاں ہی پھر یاں نظر آ رہی تھیں، حسین نے اپنے خیز کو  
کمر سے نکالا اور اس کی آنکھوں کے سامنے کر کے کہا ”یہی وہ خیز ہے جو تم سے ملا تھا۔ اور امام نجم  
الدین غیاثا پوری اور امام نصر الدین احمد کے سینوں میں خاص تمہارے حکم سے اور میرے ہاتھ سے  
اُتر پکا ہے۔ یہ خیز آج تک باقی ہے اور صرف اس لیے کہ تمہارے سینے میں خاص میرے ہاتھ سے  
سے اُتر جائے۔ اسے اچھی طرح پہچان لو اور تیار ہو جاؤ کہ انتقام کا وقت آ گیا۔“

علی وجودی: مجھے نہ مارو۔ اب میں کبھی نہ ہب باطنیہ کی طرف داری نہ کروں گا۔“

حسین: مگر تمہارا یہ عہد میرے دامن سے خون کے دھبے نہیں پھٹھرا سکتا جو تمہاری یہہ کاریوں  
سے لگے ہیں۔“ یہ کہہ کے حسین نے علی وجودی کو زمین پر گرا یا اور اس کے سینے پر  
چڑھ کے پھر اس کا خیز آنکھوں کے سامنے پیش کیا اور کہا ”یہ دیکھو اور خوب  
پہچان لو کہ یہ وہی تمہارا خیز ہے۔“

درحقیقت علی وجودی کی موت بُری موت تھی۔ اس وقت تمام گناہ طرح طرح کی بھیانک  
صورتوں کا جامد پہن کے اس کی آنکھوں کے سامنے لکھڑے تھے۔ وہ ہزار ہا مظلوم روحوں کو دیکھ رہا  
تھا جو خیز دکھادکھا کے اُسے ڈرا دھمکا رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کے آنکھیں بند کر لیں اور حسین سے  
کہا ”خدا کے لیے چھوڑ دے۔ میری بے کسی پر رحم لکھا۔“

حسین: نہیں۔ جس دل میں خود ہی خدا کا خوف اور ترس نہیں، اس پر ترس کھانا گناہ ہے۔

علی وجودی: تو کم بخت! کہیں جلدی کام تمام کر، تاکہ ان بلاوں سے پیچھا چھوٹے جو مجھے  
گھیرے ہوئے ہیں۔“

حسین: میں فقط اتنے ہی کے لیے تامل کر رہا ہوں کہ تجھے موت کی نازک اور پُر خطر گھڑی کا

اپنی طرح مزہل جائے تو تیرا کام کروں۔

اب علی وجودی بہت بے تاب تھا، حسین کے نیچے دبا ہوا تھا اور حسین اس کا دیا ہو انہر اس کی آنکھوں کے سامنے پیش کر رہا تھا جس کی ڈراونی صورت سے ڈرڈر کے وہ اپنا سر ادھر ادھر ہٹالیتا تھا ”خدا کے لیے اس چیز کو میرے سامنے سے دور کرو۔“

آخر جب حسین نے دیکھا کہ بڑی دری ہو گئی ہے اور اب قریب قریب قاعع کی ساری آبادی قتل ہو گئی ہے تو اس نے بھی خنجر بھونک بھونک کے اور آواز دے دے کے علی وجودی کا کام تمام کر دیا۔ اپنے سب سے بڑے بہکانے والے سے وہ انتقام لے کے پھر ہلاکو خان کے قریب گیا۔ اب تاتاریوں کو قتل کرنے کے لیے کوئی شخص نہ ملتا تھا۔ اتنے بڑے قتل عام سے ان کی آنکھوں میں خون اُتر آیا تھا اور مجنون گتوں یا حشی درندوں کی طرح ادھر ادھر دوڑتے پھرتے تھے کہ کوئی ملے تو اس کو قتل کر کے دل کا بخار نکالیں۔ سوائے چند کم سن اور حسین عورتوں کے جوانہ یاں بنانے کے لیے بچائی گئی تھیں، قلع الموت میں کوئی باقی نہ رہا۔

اب فرمائے الموت زکن لا دین خور شاہ کی جستجو تھی۔ لوگ دری سے اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن اس کا پتائنا چلتا تھا۔ آخر ایک تاتاری تھانے میں گھس کے اُسے پکڑا ایا۔ جیسے ہی وہ ہلاکو خان کے سامنے لا یا گیا اور تاتاری سالار کے آگے سر جھکا کے کھڑا ہوا، حسین نے جھپٹ کے ارادہ کیا کہ اپنے خنجر سے اس کا کام تمام کر دے۔ مگر ہلاکو خان نے چلا کے روکا اور کئی مغلاؤں نے بڑھ کر اس کا ہاتھ پکڑا۔

ہلاکو خان: یہ یہاں کا بادشاہ ہے اور بے کسی کی صورت میں پناہ مانگتا ہوا آیا ہے لہذا اس کی جان بخشی کرنی چاہیے۔

حسین: حسپور! اگر یہ فتح رہا تو دنیا میں بہت بڑا فتنہ رہ جائے گا۔ یہ ساری سازشیں اور تمام خرابیاں اسی کی ذات سے تھیں۔

ہلاکو خان: اب وہ سازش کرنے والے ہی نہیں رہتے تو یہ کیا کرے گا۔ سب فربیتی تو خاک و خون میں اوت رہتے ہیں۔ یہ ایک نا تجربہ کارنو جوان دنیا کو ضرر نہیں پہنچا سکتا۔

حسین: ایسا نہیں ہے کہ کوئی معتقد نہیں رہا ہو۔ مصر و شام سے لے کر سندھ تک ہر جگہ اس کے معتقد پھیلے ہوئے ہیں۔

ہلاکو خان: میں ان مقامات میں بھی جاؤں گا اور اس کے معتقد ہیں سے دنیا کو خالی کروں گا۔ مگر اس کے لیے یہی سزا کافی ہے کہ جلاوطن کر دیا جائے۔ (اس کے بعد اس نے خورشاد کی طرف دیکھ کے کہا) ”بے شک تمہارا فتنہ بہت بڑا ہے۔ مگر اس بے کسانہ اور عاجزانہ خاموشی پر ترس لکھ کے تمہاری جان بچائی جاتی ہے۔ مگر اس کے ساتھ حکم دیا جاتا ہے کہ ترکستان میں، جہاں تم کو کوئی مُرید و معتقد نہ مل سکے، اپنی زندگی کے باقی ماندہ دن بسر کرو۔ یہ جتنی عورتیں یہاں ہیں ان میں سے کوئی تھیں نہیں دی جائے گی۔ ممکن ہے کہ ان کے ذریعے سے پھر تمہارا فساد دنیا کو فریب دینے لگے۔ ترکستان میں جا کے تمہیں اختیار ہے کہ چاہے کسی تاتاری عورت سے عقد کر لیہا۔“

اس حکم کے ساتھ ہی ایک مغلی دستے نے اسے اپنی حرast میں لے لیا۔ حسین نے الموت کے تاجدار کو بخیر خزر کے اس پار ترکستان کے کسی گنمام گاؤں میں پہنچا دیا اور یہاں جب قاعده آدمیوں سے خالی ہو گیا تو تاتاری لُھیرے دولت لوٹنے، محلوں کو کھو دنے اور آگ لگانے میں مشغول ہو گئے۔ محلوں اور جنت میں ہر جگہ آگ لگادی گئی۔ وہ قصر اور کوشکیں کھود کے زمین کے برابر کر دی گئیں، جو جنت بنی ہوئی تھیں۔ اب ہر جگہ محض مٹی اور اینٹوں کے ڈھیر رہ گئے تھے۔ تاتاریوں نے

انھیں آنا فانا ایسا کر دیا کہ نہ کوئی رہنے والا تھا نہ روئے والا۔

حسین اپنے دل کی آگ بُجھا کے اور انتقام لے کے جب زمرد کے قریب گیا تو وہ نہایت ہی پریشان اور بدحواس تھی۔ وفا کیش معشوقة کو اس قدر پریشان دیکھ کر اس نے پوچھا ”زمرد، اب پریشانی کس بات کی؟“

زمرد: (روتی آواز میں) اتنا قتل عام، ایسی خون ریزی ہو چکی اور پوچھتے ہو کہ پریشانی کس بات کی ہے؟

حسین: ان طالموں کی بتاہی پر خوش ہونا چاہیے یا غمگین؟

زمرد: تم خوش ہولو، جس کا دل خدا نے ایسا پھر کا بنایا ہے۔ ایسا وحشت ہاک منظر دیکھنا کبھی میرے خیال میں نہ گزرا ہو گا۔ میں ایسی حالتوں کو دیکھنے کی عادی نہیں ہوں۔

حسین: خیر، اب بتاؤ کیا ارادہ ہے؟

شہزادی بالغان خاتون سامنے لکھری تھی۔ یہ جملہ سنتے ہی پاس آئی اور بولی ”ارادہ کیا! اب تم دونوں میرے ساتھ چلو۔ زمرد گواپی بہن سے زیادہ عزیز رکھوں گی اور تم کو بھی کسی بات کی تکلیف نہ ہو گی۔

زمرد: نہیں شہزادی! ہم دونوں نے بڑے گناہ کیے ہیں۔ حج کا ارادہ کر کے گھر سے نکلے تھے، تقدیر نے ان مُصیپتوں میں بتا کر دیا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ پہلے حج کر لیں تو پھر اور کوئی کام کریں۔ اگر زندگی باقی ہے تو یہ فرض ادا کر کے ہم دونوں وہیں قراقرم میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے۔ میں جب تک خانہ خدا میں اپنے لیے دعائے مغفرت نہ کر لوں گی۔ اس وقت تک یہ ندامت نہ نکلے گی جو ہر وقت دل میں موجود رہتی ہے۔ کوئی وقت نہیں گزرتا کہ یہ یاد نہ ستاتی ہو۔

حسین: بے شک، زمرد کا کہنا صحیح ہے۔ میرا دل ہمیشہ مجھ پر اعتماد کرتا ہے۔ شاید وہاں جا کے اور اس مقدس مقام میں دعا کر کے یہ بات دور ہو جائے۔

باغان خاتون: کیوں کر کہوں۔ دل تو نہیں چاہتا کہ تم کو جدرا کروں۔ مگر اب تم کو اصرار ہے اور وہاں جانے کو اپنا فرض سمجھتے ہو تو مجھے، تو روکنا ہے فائدہ معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میری ایک بات مان لو۔

زمرد: جو حکم ہوا! آپ کا ہر حکم بجاانا ہمارا فرض ہے۔

باغان خاتون: تم دونوں باہم عقد کرنے کی غرض سے نکلے تھے۔ میں چاہتی ہوں کہ جدرا ہوئے سے پہلے تم دونوں کا عقد کر دوں تاکہ وطن جانے سے پہلے ہی مجھے معلوم ہو جائے کہ تم دونوں میں بانٹی اتفاق کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور یہ بات یاد کر کے میں دل خوش کر دیا کروں کہ تمہاری آرزو ہمیں میرے ہی ہاتھ سے پوری ہو گئیں۔

یہ ایسی درخواست نہ تھی جس سے کسی کو انکار ہوتا۔ حسین نے صاف الفاظ میں رضا مندی ظاہر کر دی مگر زمرد مسکرائی اور ایک شرم کی آواز سے سر جھکا کے بولی۔ اب میں آپ کی اونڈی ہوں، اور جو حکم ہواں سے انکار نہیں کر سکتی۔

دوسرے دن صحیح ہلاکو خان نے فتح کی خوشی میں اور مال تقسیم کرنے کے لیے بڑا بھاری جشن کیا جس کے لیے فوج کے معوز افسروں کی ایک محفل مرتب کی گئی۔ گزشتہ فتح پر بڑے جوش و خروش سے اظہار مسرت کیا گیا اور اسی کامیابی اور ظفر کی یاد میں باغان خاتون کی درخواست اور ہلاکو خان کے حکم سے شیخ نصیر الدین طوسی جیسے محقق زمانہ اور علامہ روزگار نے جن کی تاتاریوں میں بڑی قدر و منزلت تھی اور جو اس موقع پر موجود تھے، حسین اور زمرد کا نکاح پڑھایا۔

اس کارروائی کے بعد سب آپس میں رخصت ہوئے۔ باغان خاتون نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ قراقرم کا راستہ لیا۔ ہلاکو خان نے اپنی فونِ ظفر مون کے ساتھ آذربیجان کی طرف کوچ کیا۔ حسین اور زمرد پھر اسی شان سے، جس طرح پہلے گھر سے نکلے تھے، ارضِ حجاز کی طرف روانہ ہوئے اور الموت کے گھنڈروں اور ان کی تمام لاشوں پر گدھوں اور مردار خوار طیور کے بڑے بڑے غول چھوڑ دیے۔

زمرد اور حسین نے مکہ معظمہ میں پہنچ کر، غافِ کعبہ پکڑ کے، نہایت ہی رقتِ قلب اور جوشِ دل سے مغفرت کی دعا مانگی کے اے اللہ! ہمیں تمام گناہوں سے نجات دے۔ اگر چہ ہم نے تیری نافرمانیاں کیں، تیرے مقبول و بے گناہ بندوں کی جانیں لیں مگر ہم ایک بڑے فریب میں مجبدا تھے۔ شیطان کا ہم پر اس قدرتِ تصرف تھا کہ گناہوں کی بُرانیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ہم نے گناہ کیے مگر سمجھ کر نہیں، ہمارے قدموں کو لغزشیں ہو نہیں مگر ایک بہت بڑے فریب میں مجبدا ہو کے۔ تو عالم الغیب ہے۔ دلوں کی باتیں جانتا ہے۔ ہماری بے کسی اور بے بسی کو دیکھ اور ان سخت گناہوں سے درگور کر۔ اس طرح گناہوں کا زنگِ دل سے مٹا کے واپس روانہ ہوئے۔ چند روز اپنے شہر آملا میں رہے اور باقی ماندہ زندگی قراقرم میں جا کے شہزادی باغان خاتون کی صحبت میں صرف کر دی۔

-----☆☆-----